بسم اللہ الرحمن الرحیم

چند معاصر مذاہب کا تعارفی مطالعہ

حضرت مولانا ابو عمار زاہد الراشدی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

عنوان : چند معاصر مذاہب کا تعارفی مطالعہ
محاضرات : مولانا ابو عمار زاہد الراشدی
مرتبین : مولانا حافظ کامران حیدر
ناصر الدین خان عامر
مجموعہ : اکتوبر ۲۰۲۴ء
ناشر :
اشاعت :

فہرست

☆ پیش لفظ........11
☆ عرض ناشر........12
☆ تمہیدی گفتگو........13
• تقابلِ ادیان سے پہلے تعارفِ ادیان........13
• اسلام سے منسوب مذاہب........14
• اختلاف کے مسلّمہ آداب........15
• زمانے کے ماحول سے واقفیت........17
• مذاہب کی درجہ بندی........18
• گفتگو کی ترتیب........22

یہودیت

☆ تاریخی پس منظر........24
• ایک نسلی مذہب........24
• عظیم تر اسرائیل کا ہدف........24
• عروج وزوال........25
☆ یہود مسلم کشمکش و معاملات........27
• ۶۳۸ء میں بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ........27
• مسلم ریاستیں، یہودیوں کی پناہ گاہیں........27

- بیت المقدس کیلئے حضرت عمرؓ کی اصلاحات........28

☆ یہود اور خلافتِ عثمانیہ........29

- فلسطین، خلافتِ عثمانیہ کا صوبہ........30
- صہیونیت کیا ہے؟........30
- یہودیوں کی فلسطین میں آباد کاری کے لیے درخواست........31
- ۱۹۱۷ء یہود اور برطانیہ کے درمیان "بالفور معاہدہ"........32
- ۱۹۱۷ء میں فلسطین پر برطانوی اتحاد کا قبضہ........33
- فلسطینی زمین کی فروخت کے متعلق جید علماء کرام کا فتویٰ........34

☆ ریاست اسرائیل........34

- ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ کے ذریعے اسرائیلی ریاست کا قیام........34
- بیت المقدس کے دعویدار مذاہب........35
- ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کا بیت المقدس پر قبضہ........36
- امریکہ، اسرائیل کا سب سے بڑا سہارا........37
- عیسائی یہود گٹھ جوڑ........38
- طاقت کا عالمی توازن........39

☆ دورِ حاضر میں یہود کا کردار........40

- امریکہ اور یورپ میں اثر و رسوخ........41
- یہودیوں اور قادیانیوں میں مماثلت........42
- یہود کا ہدف........43
- جناب رسول اللہ اور یہود و نصاریٰ کا حسد........43
- دنیا پر غلبے کا ایجنڈا........44

☆ اسرائیل کے بارے میں عالمِ اسلام کا موقف........45

عیسائیت

☆ ابتدائی دور 49
☆ دورِ نبویؐ میں مسلم عیسائی معاملات 49
- عیسائی عالم ورقہ بن نوفل کی تصدیق 50
- ابوطالب اور حضرت عباسؓ کی پشت پناہی 51
- عیسائی بادشاہ اصحمہ نجاشیؓ کی پناہ گاہ 52
- عیسائی بادشاہوں کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط 52
- بنوطے کا عیسائی قبیلہ 54
- نجران کے عیسائیوں سے واسطہ 55
- بین المذاہب مکالمہ کی بنیاد 57
- بین المذاہب مکالمہ کے فریقین اور ایجنڈا 58
☆ خلافتِ راشدہ کے دور میں مسلم عیسائی کشمکش 61
- موتہ کا معرکہ 61
- تبوک کا معرکہ 62
- نبی اکرمؐ کا وصال اور حضرت ابوبکرؓ کی استقامت 64
- حضرت عمرؓ کا دورِ خلافت 65
- حضرت خالد بن ولیدؓ کا شکوہ اور خراجِ عقیدت 66
- شام، مصر اور عراق کی فتوحات 67
☆ دورِ خلافتِ راشدہ کے بعد 67
☆ اندلس کی خلافتِ بنوامیہ 69
- بنواُمیہ اور بنوعباس کی کشمکش 69
- یورپ کی حالتِ زار 71

- عباسی دور کی دستور سازی..........72
- مسلم دنیا میں فقہی تقسیم..........73
- علم و فلسفہ کی پشت پناہی کے لیے طاقت کی ضرورت..........74
- سائنس وٹیکنالوجی اور مسلم سلطنتوں کا طرزِ عمل..........76
- امریکہ کی دریافت..........77
- اندلس میں شکست کے بعد مسلمانوں کے لیے راستہ..........78
- امریکہ کی ہسپانوی نسل کے مسلمان..........78
- تلخ داستانیں..........79

☆ صلیبی جنگیں..........80
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا "انتقال"..........80
- عیسائی فرقوں کی عملداری..........81
- صلیبی جنگوں کا پس منظر..........81
- پوپ اربن ثانی کا فتویٰ "جہاد"..........83
- صلیبی جنگوں کے بعد..........85

☆ عیسائی ممالک کا نوآبادیاتی دور..........85
- تجارت سے حکمرانی تک کا سفر..........86
- ۱۷۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا بنگال پر قبضہ..........87
- ۱۷۹۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا میسور پر قبضہ..........88
- سائنس وٹیکنالوجی: خلافتِ عثمانیہ اور سلطنتِ مغلیہ کی کوتاہ اندیشی..........89
- عراق میں جرمنی کی تیل نکالنے والی کمپنیاں..........90
- ٹیپو سلطانؒ کی خلافتِ عثمانیہ سے درخواست..........91
- ۱۸۲۲ء میں شاہ عالم ثانی کی شکست..........92
- مسلم ریاست کی غیر موجودگی میں جہاد کا فتویٰ..........94

ہندومت

☆ تعارف اور تاریخی پس منظر........97
• ویدوں کی حقیقت........97
• داخلی مذاہب........98
• دیانند سرسوتی کی "ستیارتھ پرکاش"........98
☆ عقائد ورسومات........99
• حلول کا عقیدہ........99
• گائے کا تقدس........100
• مسئلہ تناسخ اور جنم کا تصور........101
• خاوند اور بیوی کا تعلق........102
• ذات پات کا معاملہ........103
☆ ہندو مسلم کشمکش کا دور........104
☆ مغلوں کے زوال کے بعد ہندو مسلم تعلقات........105

سکھ مت

☆ باباگرونانک اور سکھ مذہب........108
• صوفیاءکرام اور خانقاہی نظام کی طرف رجوع........108
• سکھ مذہب کا آغاز........110
• مذہبی علامات........110
☆ گردوارہ اور خانقاہ کی مناسبت........111
• برنگھم برطانیہ کے گردوارہ کا احوال........111
• صوفیاءکرام سے عقیدت........112

- امرتسر گولڈن ٹیمپل اور حضرت میاں میرؒ..112
☆ مغلوں اور سکھوں کی کشمکش..113
- "گرو" کا پس منظر..113
- ایک سکھ سردار کے ساتھ شکووں کا تبادلہ..114
☆ سکھ ریاست کا دور..114
- مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت..115
- جہادِ بالاکوٹ کا پس منظر..116
☆ ۱۸۵۷ء کی جنگ اور بعد کی صورتحال..117
- تحریکِ آزادی میں کردار اور پنجاب کی تقسیم..118
- "خالصتان" کی تحریک..118
- طالبان حکومت اور کابل کے سکھ..119

بدھ مت

☆ پس منظر..121
- مہاتما بدھ..121
- اشوکِ اعظم..123
- بدھ مت کی تعلیمات..123
- چند باتیں علماء کرام سے..124
- اراکان (برما/میانمار) کے روہنگیا مسلمانوں کا مسئلہ..127

دورِ اول کے مدعیانِ نبوت

☆ منحرف مذاہب..132
☆ مسیلمہ..133

☆ طلیحہ اسدی.......135
☆ اسود عنسی.......137
☆ سجاح.......138

دورِ حاضر کے مدعیانِ نبوت

☆ ذکری مذہب.......142
- محمد مہدی.......142
- "معراج نامہ".......142
- شرعی احکام کی تنسیخ.......143
- ذکری کلمہ.......144

☆ بہائی مذہب.......144
- مرزا محمد علی.......144
- مرزا بہاء اللہ شیرازی اور "الواحِ مقدسہ".......145
- بہائیوں کا قبلہ.......146
- اتحاد بین المذاہب کا عنوان.......146
- انیس کا عدد.......147
- بہائیوں اور قادیانیوں میں مماثلت.......149

☆ نیشن آف اسلام.......150
- امریکہ میں گوروں اور کالوں کی کشمکش.......150
- ماسٹر فارد محمد.......152
- آلیجا محمد.......152
- مالکم شہبازؒ.......153
- عقائد و تعلیمات.......153

- عالمی مکہ باز محمد علی کلےؒ 154
- ویلس دین محمد 154
- لوئیس فرخان 155

☆ قادیانیت 156
- قادیانیت پر مسلم مناظرین 157
- مرزا غلام احمد قادیانی کا مہدی و مسیح ہونے کا دعویٰ 157
- ختمِ نبوت کا عقیدہ 159
- متفرق مسائل 160
- پارلیمنٹ کے ذریعے قادیانیوں کی تکفیر 160
- مباہلے کا میدان 162
- حسن عودہ کا قبولِ اسلام 164
- قادیانیوں کے ساتھ سماجی معاملہ 165
- علامہ محمد اقبالؒ کی تجویز 166

ضمیمہ

☆ مذہب کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر 169

☆ مذاہب اور مذہبی اکابر کی اہانت کا مسئلہ 173

☆ ہندو مذہب حقیقت کے آئینے میں 175

☆ مسلم سکھ تعلقات کا ایک جائزہ 180

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

ہمارے ہاں ''تقابلِ ادیان'' کے عنوان سے مختلف اداروں میں کورسز منعقد ہوتے رہتے ہیں جن میں عام طور پر ادیان و مذاہب کے ساتھ ہمارے اعتقادی مباحث علماء کرام اور طلبہ کو پڑھائے جاتے ہیں اور ہر سال ہزاروں حضرات اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ مجھے بھی کافی عرصہ سے ان کورسز میں شرکت اور گزارشات پیش کرنے کا موقع مل رہا ہے، جو انتہائی ضروری اور مفید ہیں، مگر اس سلسلہ میں میری گزارش یہ ہوتی ہے کہ اعتقادی مباحث کے ساتھ ساتھ ان گروہوں کا تعارف اور ان کے ساتھ مسلم معاشرہ کو درپیش معاملات بھی ہمارے پیش نظر رہنے چاہئیں اور علماء کرام و طلبہ کو ان سے واقف کرانا بھی ضروری ہے، چنانچہ ایسے کورسز میں میری گفتگو اسی دائرہ میں ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ قبل الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے زیر اہتمام اس موضوع پر ایک کورس میں کی گئی گزارشات کو مرتب صورت میں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ یہ معروضات اساتذہ و طلبہ اور دینی کارکنوں کے لیے مفید ثابت ہوں گی، اللہ تعالیٰ قبولیت سے نوازیں اور اس کے ثمرات سے ہم سب کو بہرہ ور فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

ابو عمار زاہد الراشدی
ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ
۲۱ جون ۲۰۲۳ء

عرض ناشر

تمہیدی گفتگو

نحمده تبارک وتعالیٰ ونصلی ونسلم علیٰ رسوله الکریم وعلیٰ آله واصحابه واتباعه اجمعین۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ ہمارے ہاں ”تقابلِ ادیان“ کے عنوان سے مختلف مدارس اور مراکز میں کورسز ہوتے ہیں جن میں ادیان و مذاہب کے درمیان چند اعتقادی اختلافات پر مباحثہ و مناظرہ کی تربیت دی جاتی ہے، جو اپنے مقاصد کے اعتبار سے انتہائی ضروری ہے اور اس کی افادیت سے انکار نہیں ہے۔ مگر میری طالب علمانہ رائے میں یہ اس وسیع تر موضوع کے لحاظ سے انتہائی محدود اور جزوی سا دائرہ ہے جبکہ اس عنوان پر اس سے کہیں زیادہ وسیع تناظر میں گفتگو کی ضرورت ہوتی ہے۔

تقابلِ ادیان سے پہلے تعارفِ ادیان

اس سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ تقابل سے پہلے تعارف ضروری امر ہے کہ جس گروہ سے آپ اختلاف کر رہے ہیں اس کا کم از کم اجمالی تعارف تو آپ کے سامنے ہو کہ:

- اس کا آغاز کب ہوا تھا اور اس کی مختصر تاریخ کیا ہے؟
- آپ کے ساتھ اس گروہ کے اختلافات کا بنیادی دائرہ کیا ہے؟
- بڑے بڑے مختلف فیہ مسائل کون سے ہیں؟
- اس گروہ کے ساتھ آپ کے سماجی اور معاشرتی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟
- اور اعتقادی اختلافات سے ہٹ کر آپ دونوں کے درمیان سیاسی، معاشرتی اور سماجی تنازعات کیا ہیں؟

اس مجموعی تناظر سے آگاہی کے بغیر چند اختلافی مسائل پر مباحثہ کرنا مناظرے کے ماحول میں تو یقیناً فائدہ مند ہوتا ہے، لیکن آج کے عالمگیر ماحول میں اس گروہ کے صحیح معاشرتی مقام کی پہچان اور اس

کے ساتھ معاملات و تنازعات کے تعیّن میں اس سے کوئی راہنمائی نہیں ملتی۔ مثلاً مسیحیت کے بارے میں دیکھ لیجئے کہ اس مذہب کے ساتھ اعتقادی مباحث میں (۱) توحید یا تثلیث (۲) کفارہ (۳) ابنیت مسیح (۴) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ آسمانوں پر اٹھایا جانا وغیرہ مسائل یقیناً اہمیت رکھتے ہیں لیکن عملی معاملات میں اس سے کہیں زیادہ اہم امور یہ ہیں کہ:

- جناب نبی اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کے دور میں مسیحی مسلم تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟
- رومیوں کے ساتھ مسلمانوں کی جنگوں کا تناظر کیا تھا؟
- صلیبی جنگوں کا مقصد اور نتیجہ کیا تھا؟
- خلافتِ عثمانیہ اور صلیبیوں کی کشمکش کا ماحول کیا تھا؟
- بہت سے مسلمان ممالک پر چند مسیحی ممالک نے نوآبادیاتی قبضہ کیسے کر لیا تھا؟
- مسلمانوں کے علوم و معارف کو تشکیک کا نشانہ بنانے کے لیے استشراق کی علمی و فکری تحریک کے اہداف و نتائج کیا تھے؟
- اور اس وقت دنیا بھر میں مسلمانوں اور مسیحیت کے باہمی تعلقات و تنازعات کی صورت حال کیا ہے؟ وغیر ذٰلک۔

اعتقادی مباحث تو مسیحی دنیا نے ایک عرصہ سے ترک کر رکھے ہیں اور انہوں نے مسلمانوں کے مقابلہ میں بہت سے دیگر ذرائع اور اسباب اختیار کیے ہوئے ہیں جو ہمارے تعلیمی موضوعات سے ہی خارج ہیں۔ یہی صورت حال یہودیت، ہندومت، سکھ مت اور بدھ مت کے بارے میں بھی ہے۔ یہ وہ مذاہب ہیں جو آج کی موجود دنیا میں ہمارے معاصر ہیں اور ان کے ساتھ دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کو ہر وقت مسائل در پیش رہتے ہیں۔

اسلام سے منسوب مذاہب

اسی طرح مسلمانوں کے داخلی مذاہب کا معاملہ بھی ہے۔ دنیا بھر میں مسلمان کہلانے والی تقریباً دو ارب کے لگ بھگ آبادی کو جس گروہ بندی کا سامنا ہے، اور جن حصوں بخروں میں وہ اس وقت نہ صرف تقسیم بلکہ باہم برسرِپیکار ہے اس کے پورے تناظر میں ہم اگر کہیں بات کرتے بھی ہیں تو وہ چند اعتقادی مباحث تک محدود ہوتی ہے۔ مجھے اس کی اہمیت و ضرورت سے کسی درجہ میں بھی انکار نہیں

ہے لیکن یہ صرف ایک جزوی سا پہلو ہے جو ناکافی ہے۔ یہاں میں مثال کے لیے قادیانیت کا حوالہ دوں گا کہ ان کے ساتھ ہمارے اعتقادی مباحث میں (۱) ختمِ نبوت یا اجرائے نبوت (۲) رفع ونزول عیسیٰ علیہ السلام (۳) صدق وکذبِ مرزا جیسے مسائل یقیناً بنیادی اور مرکزی نوعیت کے ہیں جن کا علماء وطلبہ کو پڑھانا ضروری ہے، لیکن:

- قادیانی گروہ کا تعارف وپس منظر،
- اس کے دو بڑے گروہوں میں فرق،
- تحریکِ آزادی میں اس گروہ کا کردار،
- پاکستان کے قیام اور تقسیمِ پنجاب میں اس کا کردار،
- بین الاقوامی اداروں میں اس کی اسلام اور پاکستان کے خلاف مسلسل سرگرمیاں،
- اور عالمی سطح پر اسلام دشمن قوتوں کے ساتھ اس کا اشتراکِ عمل وغیرہ

بھی کم اہمیت کے امور نہیں ہیں جن کی طرف ہماری توجہ نہیں ہے۔ حالانکہ اس حوالے سے نہ صرف قادیانیت بلکہ ختمِ نبوت کا انکار کرنے والے دیگر معاصر گروہوں مثلاً بہائیت، ذکری مذہب اور نیشن آف اسلام وغیرہ سے بھی اسی درجہ کی آگاہی ضروری ہے۔

اختلاف کے مسلّمہ آداب

تیسرے نمبر پر میں توجہ دلانا چاہوں گا کہ اختلافات پر بحث ومباحثہ میں اختلافات کی درجہ بندی اور اختلاف کے مسلّمہ آداب کا ہمارے ہاں عام طور پر لحاظ نہیں رکھا جاتا:

- بعض اختلافات کفر و اسلام کے ہیں مثلاً مسیحیت، یہودیت، ہندو مت، سکھ مت، قادیانیت، بہائیت، نیشن آف اسلام وغیرہ۔
- بعض اختلافات حق و باطل کے ہیں مثلاً خوارج، روافض، معتزلہ وغیرہ کے ساتھ، جن کا دائرہ پہلے دائرے سے یقیناً مختلف ہے۔
- بعض اختلافات خطا و صواب کے ہیں جیسا کہ احناف، شوافع، حنابلہ، مالکیہ اور ظواہر کے فقہی اختلافات، ان کا درجہ محض صواب وخطا کا ہے اور حق و باطل کے معرکہ کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

- اس سے نیچے اختلافات کا ایک بہت بڑا دائرہ اولیٰ اور غیر اولیٰ کا ہے جسے صواب و خطا میں تقسیم کرنا بھی درست نہیں ہوتا۔

لیکن ہمارے مناظرانہ مباحث میں یہ سب دائرے اس طرح خلط ملط ہو گئے ہیں کہ بسا اوقات اولیٰ غیر اولیٰ کے مسائل میں ہم حق و باطل کے لہجے میں بات کر رہے ہوتے ہیں، اور خطا و صواب کا معرکہ تو کبھی کبھی کفر و اسلام کی باقاعدہ جنگ بن جاتا ہے۔ عمومی ماحول میں ان معاملات میں بے احتیاطی اور لا پروائی کے ایسے معاملات سامنے آتے ہیں کہ میرے جیسے کمزور لوگوں کو ایمان خطرے میں محسوس ہونے لگتا ہے۔ ایک بڑے خطیب صاحب جو وفات پا چکے ہیں، اللہ ان کی مغفرت فرمائیں، آمین۔ وہ ایک بار کسی عوامی جلسہ میں مادۂ تولید کے پاک یا ناپاک ہونے کے اختلافی مسئلے پر مخالف فریق کے وہ لتے لے رہے تھے کہ ان کے قریب بیٹھے مجھے شرم آ رہی تھی۔ انہوں نے ٹھیٹھ پنجابی لہجے میں لتاڑنے کی خوب مہارت دکھائی۔ جلسہ سے فارغ ہونے پر جب کھانے کے لیے بیٹھے تو میں نے پوچھ لیا کہ حضرت! منی کے پاک ہونے کا یہ موقف، جسے آپ نے موضوعِ بحث بنایا ہوا تھا، متقدمین میں سے بھی کسی کا ہے؟ فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ یہ حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور حضرت امام سفیان ثوریؒ کا موقف ہے۔ اس پر وہ چونکے۔ میں نے گزارش کی کہ کسی فقہی مسئلہ پر طعن و تشنیع کا توپ خانہ گاڑتے وقت یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ اس کا رخ کدھر ہے؟

ایسے مسائل میں خاص طور پر اساتذہ سے ہماری گزارش ہوتی ہے کہ اختلافات سکھاتے وقت ادب الاختلاف بھی پڑھایا کریں تاکہ ہمارے نوجوان علماء کو معلوم ہو کہ کس سے کس درجہ میں اختلاف کرنا ہے اور کس لہجے میں کرنا ہے۔ ”ادب الاختلاف“ پر متقدمین اور متاخرین علماء نے بہت کچھ لکھا ہے جسے باقاعدہ پڑھنے اور پڑھانے کی ضرورت ہے۔ جبکہ اس سلسلہ میں دو سال قبل کراچی کے ایک فاضل دوست ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن نے ماہنامہ ”تعمیرِ افکار“ کا پونے چھ سو کے لگ بھگ صفحات پر مشتمل ضخیم نمبر شائع کیا ہے جو مسلکی اور فقہی اختلافات کی حدود و قیود اور آداب کے تقریباً تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ میرے خیال میں اعتقادی اور فقہی علوم پڑھانے والے اور ان مباحث کی تربیت دینے والے تمام مدرسین اور اساتذہ کو لازماً یہ رسالہ پڑھنا چاہیے جسے زوار اکیڈمی پبلیکیشنز، اے

۴/۸۱ ناظم آباد ۴ کراچی سے طلب کیا جا سکتا ہے۔

زمانے کے ماحول سے واقفیت

اس وقت انسانی سوسائٹی میں ہمیں کن مذاہب، کن مسالک اور کن افکار سے واسطہ ہے؟ سوسائٹی تو گلوبل ہوتی جا رہی ہے اور مشرق، مغرب، شمال، جنوب میں کوئی فرق نہیں رہا، نہ معلومات کے حوالے سے اور نہ رابطوں کے حوالے سے۔ اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس زمانے کی نشاندہی کی تھی "یتقارب الزمان" یہ آپؐ کی پیشین گوئیوں میں ہے جو آپؐ نے قیامت کی نشانیوں میں بیان فرمائی تھی کہ زمانے ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے، جس کا آسان ترجمہ ہم کیا کرتے ہیں کہ فاصلے سمٹ جائیں گے۔ آج کے دور میں زمینی فاصلے بھی اور زمانی فاصلے بھی سمٹ گئے ہیں اور مزید سمٹتے جا رہے ہیں۔ پہلے اونٹوں کا سفر ہوتا تھا، اب جہازوں کا ہوتا ہے۔ پہلے پیغام، خط و کتابت کے ذریعے پہنچایا جاتا تھا، اب واٹس اپ کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے اردگرد ماحول اور دنیا سے واقف ہونا چاہیے۔

قرآن کریم نے بھی یہی کیا تھا جب جناب نبی کریمؐ تشریف لائے اور مکہ مکرمہ میں آپؐ کی ایک جماعت بنی تو قرآن کریم کا اسلوب یہی رہا ہے کہ جزیرۃ العرب کے دائرے میں جن مذاہب سے عملی واسطہ تھا ان مذاہب کا تفصیل سے تعارف کروایا ہے۔ زیادہ تر مشرکینِ عرب تھے جو خود کو اسماعیلی یا قریشی کہتے تھے، ان کے اسلوب و عقائد، ان کی سماجی و تہذیبی روایات، ان کا خاندانی نظام، ان کا پورا سسٹم قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔ مدینہ منورہ جا کر یہودیوں سے واسطہ پیش آیا تو یہودیوں کا بھی قرآن کریم نے پورا تعارف کروایا ہے۔ ان کا پس منظر، ان کی تاریخ، ان کے عقائد اور ان کی گمراہیاں کھول کر بیان فرمائیں۔ تیسرے مسلمانوں کا واسطہ جزیرۃ العرب میں نجران کے عیسائیوں سے تھا۔ نجران میں عیسائی بہت بڑی تعداد میں تھے اور بنو تغلب بھی عیسائی تھے۔ تو قرآن کریم نے عیسائیوں کا تعارف بھی کروایا ہے۔ تینوں حوالوں سے کہ ان کے عقائد کیا ہیں، ان کا تاریخی پس منظر کیا ہے، ان کی روایات و معمولات کیا ہیں، تہذیبی ماحول کیا ہے، اور چوتھے نمبر پر ان کی گمراہیاں تفصیل سے بیان فرمائی ہیں۔

قرآن کریم کا اسلوب یہ بتا رہا ہے کہ اردگرد کے ماحول سے واقف ہونا چاہیے، خود عمل کرنے کے

حوالے سے بھی اور تحریکات کے حوالے سے بھی۔ جزیرۃ العرب میں اس وقت سب سے کم واسطہ صابئین سے تھا لیکن قرآن کریم نے ان کا ذکر بھی کیا ہے، اگرچہ ان کی تفصیلات بیان نہیں کیں۔ اس تناظر میں ہر دور میں ضروری ہے کہ ہم اپنے ماحول سے واقف ہوں کہ جن مذاہب سے ہمیں واسطہ ہے، ہمارا ان کا فرق کیا ہے؟ تنازعات کہاں ہیں؟ اتفاقات و اختلافات کہاں کہاں ہیں؟

ہمارے ہاں عام طور پر ایک مغالطہ ہے کہ ہم جب تقابلِ مذاہب کی بات کرتے ہیں تو ہمارے ہاں چند مناظرانہ مسائل ہی تقابلِ مذاہب سمجھے جاتے ہیں۔ عیسائیوں سے بات ہوگی تو مناظرے کے دو چار مسائل موضوع بن جائیں گے اور اسی پر سارا وقت صَرف ہو جائے گا۔ وہ ایک حصہ ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے۔ یا مثلاً ہم قادیانیوں کی بات کریں گے تو چند مناظرانہ مسائل پر مباحثہ سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ جبکہ اس کے ساتھ بلکہ اس سے زیادہ ضروری ہے کہ ہم ان کے پس منظر سے واقف ہوں، تاریخ سے واقف ہوں، اور ان کا تعارف حاصل ہو۔

اس لیے میری ترتیب یہ ہوتی ہے کہ پہلے تعارفِ ادیان اور پھر تقابلِ ادیان، مناظرے کے طور پر نہیں بلکہ بریفنگ کے طور پر کہ ہمارا اور ان کا فرق کیا ہے۔ پہلے تعارف کہ یہ کون لوگ ہیں ان کی ابتدا کب ہوئی؟ یہ کہاں کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ ہمارا اُن سے فرق کیا ہے؟ اور یہ بات بھی عرض کرتا ہوں کہ ان کے ساتھ اس وقت عالمی سوسائٹی میں ہمارے معاملات کی نوعیت کیا ہے، کہاں جھگڑا ہے، کہاں نہیں ہے، کہاں ہم اکٹھے ہیں، کہاں الگ الگ ہیں، ہمارے عملی مسائل اس وقت کیا ہیں؟ یہ تین باتیں (۱) ان کا تعارف (۲) ان کا مسلمانوں سے بنیادی معاملات کا فرق (۳) اور تنازعات کی موجودہ صورتحال (۴) مناظرہ چوتھے نمبر پر ہوتا ہے۔ میرا ذوق مناظرے کا نہیں ہے لیکن میں مناظرے مجادلے کی نفی نہیں کرتا، مناظرہ مجادلہ کیا جاتا ہے، کیا جانا چاہیے۔

مذاہب کی درجہ بندی

اس کے بعد مذاہب کی درجہ بندی بھی ضروری ہے۔ ہم جب تقابلِ مذاہب کی بات کرتے ہیں تو ہمارے نزدیک یہودی مسلم جھگڑا اور حنفی غیر مقلد جھگڑا ایک ہی لیول کا سمجھا جاتا ہے۔ ہمارا لہجہ دونوں جگہ ایک ہی ہوتا ہے، گفتگو کا انداز بھی ایک جیسا ہوتا ہے۔ درجہ بندی کے بغیر کسی مذہب سے بات کرنا بنیادی طور پر صحیح بات نہیں ہے۔ درجہ بندی کیا ہے؟ ایک درجہ بندی تو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے کی

ہے۔ شاہ صاحبؒ نے ”حجۃ اللہ البالغۃ“ میں درجہ بندی اس اسلوب سے بیان کی کہ

۱. ایک دائرہ ہے مذاہب وادیان عیسائی اور یہودی وغیرہ۔

۲. شاہ صاحبؒ اہلِ اسلام میں درجہ بندی کرتے ہوئے اہلِ قبلہ کا دائرہ بناتے ہیں۔ اہلِ قبلہ میں قرآن کریم، جناب نبی کریمؐ، اور قبلہ کی بات کرنے والے سب کو شامل کرتے ہیں۔ ان میں اہلِ سنت تو ہیں ہی۔ مگر خوارج، معتزلہ، روافض اور کرامیہ جیسے اعتقادی فرقوں کو بھی اہلِ قبلہ میں شمار کرتے ہیں۔

۳. تیسرے نمبر پر اہلِ سنت کے داخلی مذاہب، فقہاء کا دائرہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی وغیرہ۔

لیکن شاہ صاحبؒ کے زمانے میں بعض باتیں نہیں تھیں جو کہ اب ہو گئی ہیں، اس لیے میری ترتیب میں یہ ہوتا ہے کہ:

۱. سب سے پہلے ادیان و مذاہب جو مستقل ہیں، مثلاً اس وقت آٹھ ارب کے لگ بھگ آبادی میں ہم مسلمانوں کو مجموعی طور پر جن مذاہب سے واسطہ ہے ان میں یہودی، عیسائی، ہندو، سکھ، بدھ اور مجوسی وغیرہ مستقل مذاہب ہیں۔

۲. اس کے بعد ہمیں واسطہ ہے منحرفین سے۔ یہ مستقل دائرہ بن گیا ہے منحرف مذاہب کا جیسے قادیانی، بہائی، نیشن آف اسلام، ذکری، رشادی وغیرہ، جو نام اور ٹائٹل اسلام کا استعمال کرتے ہیں مگر نبوت و وحی کے نام پر نیا مذہب بنالیا ہے۔ شاہ صاحبؒ کے زمانے میں یہ دائرہ نہیں تھا، یہ دونوں کفر و اسلام کے دائرے ہیں۔

۳. تیسرے نمبر پر جنہیں شاہ صاحبؒ اہلِ قبلہ کہتے ہیں جو نئی نبوت کی بات نہیں کرتے اور اسلام کی چند بنیادی باتوں کو تسلیم کرتے ہیں، یہ حق و باطل کا دائرہ ہے۔ ان میں اہلِ سنت اہلِ حق ہیں جبکہ خوارج، معتزلہ، روافض اہلِ باطل ہیں۔

۴. چوتھا دائرہ اہلِ سنت کے داخلی اختلافات کا ہے۔ اس دائرے میں تین ذیلی دائرے ہیں: ایک اعتقادی، دوسرا فقہی، تیسرا روحانی۔ ان تینوں کو الگ الگ سمجھنا ضروری ہے:

(۱) اعتقادی تو یہ ہے کہ تمام اہلِ سنت کے عقائد ایک ہی ہیں البتہ تعبیرات میں فرق ہے۔ اس میں تین مستقل مکاتب ہیں: اشاعرہ، ماتریدیہ اور ظواہر۔ آج کے دور میں

ظواہر کی جگہ سلفی یا اہلِ حدیث ہیں۔ ان میں کچھ متشدد دین ہیں اور کچھ معتدل، جو کہ ہر جگہ ہوتے ہیں۔

(۲) دوسرا دائرہ فقہی احکام و مسائل کا ہے۔ احناف، شوافع، حنابلہ، مالکیہ، ظواہر۔ پانچ مکاتبِ فکر ہیں۔ ان میں بھی ایک خطا و صواب کا دائرہ ہے اور ایک اولیٰ و غیر اولیٰ کا دائرہ ہے۔

- فقہاء کے آپس کے مسائل کی نوعیت خطا و صواب کی ہے۔ ہماری الجھن یہ ہے کہ ہم کسی وقت اولیٰ و غیر اولیٰ کے مسئلہ پر یا خطا و صواب کے مسئلہ پر بات کر رہے ہوتے ہیں لیکن ہتھیار ہمارے پاس کفر و اسلام کے ہوتے ہیں۔ فقہاء (احناف، شوافع، حنابلہ، مالکیہ، ظواہر) کا آپس کا دائرہ خطا و صواب کا دائرہ ہے، حق و باطل کا دائرہ نہیں ہے۔ ہم مجتہد کے بارے میں اصولی بات یہ کرتے ہیں "المجتھد یخطیٔ و یصیب"۔ مثال کے طور پر ہم امام ابو حنیفہؒ کے مقلد ہیں ان کے فتوے کو دلیل پوچھے بغیر مانتے ہیں، لیکن یہ کہہ کر مانتے ہیں "صواب یحتمل الخطاء" اور اس کو حق و باطل کا عنوان نہیں دیں گے۔ حضرت امام شافعیؒ کے کسی فتویٰ کو ہم قبول نہیں کرتے تو یہ کہہ کر کہ "خطاء یحتمل الصواب" اور اس کو باطل نہیں کہیں گے۔
- اس سے اگلا دائرہ اولیٰ و غیر اولیٰ کا ہے۔ ہمارے بیسیوں فقہی اختلافات اولیٰ و غیر اولیٰ پر جا کر منتج ہو جاتے ہیں۔ فقہی احکام میں بالخصوص ہم بعض اوقات بہت تشدد کر جاتے ہیں، ہمیں اپنے رویے پر غور کرنا ہوگا۔ میں حنفی ہوں اور الحمد للہ شعوری حنفی ہوں، متصلب حنفی ہوں، احناف کے دائرے کو سمجھتا بھی ہوں، پابندی بھی کرتا ہوں، عمل بھی کرتا ہوں، تلقین بھی کرتا ہوں۔

لیکن یہ عرض بھی کیا کرتا ہوں کہ حنفیت کے مجادلے میں صحیح ترجمان اور آئیڈیل امام طحاویؒ ہیں۔ حنفی اور غیر فقہی اختلاف کے اسلوب کو سمجھنے کے لیے میرے ذوق کے مطابق امام طحاویؒ سے بڑا کوئی آئیڈیل نہیں ہے۔ فقہی مجادلے

میں امام طحاویؒ کی ’’شرح معانی الآثار‘‘ کی چند خصوصیات کا میں ذکر کیا کرتا ہوں، آپ نے اس کتاب کا کوئی حصہ پڑھا ہو گا، اس کے چند صفحات پر دوبارہ غور کریں۔ طحاوی کی تمہید کی تین چار سطروں میں انہوں نے ذکر کیا کہ فقہی مجادلے کی بنیاد انہوں نے کس پر رکھی ہے۔ امام طحاویؒ کہتے ہیں: احادیث مختلف ہیں، ایک ایک مسئلہ پر تین تین چار چار مختلف احادیث ملتی ہیں جس سے (۱) ملحدین غلط فائدہ اٹھاتے ہیں (۲) اور کمزور ایمان کے مسلمان شک کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ دو وجہیں بیان کی ہیں۔ امام طحاویؒ کہتے ہیں میں نے الحاد کو دور کرنے کے لیے اور مسلمانوں کے تذبذب کو رفع کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی ہے۔

گویا فقہی مجادلہ کا بنیادی مقصد امام طحاویؒ کے ہاں اختلافات کو پھیلانا نہیں بلکہ سمیٹنا ہے، شکوک کو بڑھانا نہیں ہے بلکہ کم کرنا ہے۔ امام طحاویؒ نے یہ اسلوب اختیار کیا کہ ایک مسئلہ پر مثلاً تین موقف ہیں تو تینوں کے دلائل الگ الگ بیان کریں گے۔ پہلے مخالفین کے دلائل بیان کریں گے، پوری دیانت داری سے بیان کریں گے، پھر اپنے نقطۂ نظر سے اس میں کمزوری واضح کریں گے۔ پھر دوسرا موقف بیان کریں گے، ان کے دلائل بیان کریں گے، پھر اپنا موقف بیان کریں گے۔ پھر دلائل کا تقابل کریں گے۔ دلائل کے تقابل کی علمی بحث کے بعد اس کی درجہ بندی کریں گے کہ یہ ہمارے نزدیک جواز اور عدمِ جواز کا مسئلہ ہے، یا مکروہ اور غیر مکروہ کا مسئلہ ہے، یا اولیٰ اور غیر اولیٰ کا مسئلہ ہے۔ اور جہاں اپنے دلائل میں کمزوری محسوس کریں گے وہاں اعتراف کریں گے کہ یہاں ہمارے دلائل کمزور ہیں۔

(۳) اور تیسرا دائرہ روحانی ہے۔ صوفیاء کرام کا تزکیہ و اصلاح کا خانقاہی نظام بھی مسلم معاشرے کا حصہ چلا آ رہا ہے۔ ہمارے ہاں نقشبندی، قادری، چشتی اور سہروردی سلسلے روحانی تربیت کے حوالے سے مختلف مکاتبِ فکر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

چنانچہ اہلِ سنت کے داخلی دائروں میں اعتقادی تعبیرات کا مسئلہ ہو، یا فقہی احکام کا مسئلہ ہو، یا روحانی سلسلے کا آپس کا کوئی مسئلہ ہو، اس پر حق و باطل کی بات نہیں کریں گے بلکہ خطا و صواب کی بات کریں گے۔

گفتگو کی ترتیب

مذاہب و ادیان کے تعارف کے موضوع میں پہلے ہم ادیان و مذاہب کی بات کریں گے، پھر منحرفین کے دائرے کی، اور پھر حق و باطل کے دائرے کی (اہل سنت، خوارج، روافض کی) بات کریں گے۔ اور آخر میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اس وقت جو ہماری جنوبی ایشیا میں مسلکی تقسیم ہے دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث، یہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی فکری و فقہی تقسیم ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے نہ کوئی دیوبندی تھا، نہ کوئی بریلوی تھا، نہ کوئی اہلِ حدیث تھا۔ جبکہ اعتزالِ جدید کا بھی ایک مستقل طبقہ ہے جن کو ہم متجددین کہتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہماری اس مذہبی تقسیم کا سبب کیا بنا؟ اور ہمارا موجودہ فرق کیا ہے اور تنازعات کیا ہیں؟ یہ بھی جاننا ضروری ہے، اس پر بھی بات کرنا چاہوں گا۔ ہم کرامیہ اور معتزلہ کا پس منظر تو معلوم کر لیتے ہیں لیکن دیوبندی اور بریلوی جھگڑے کا پس منظر کیا ہے، ہم اسے معلوم نہیں کرتے۔ آج میں نے آپ کو درجہ بندی بتائی ہے کہ کس ترتیب سے ہم بات کریں گے، لیکن سارے کا وعدہ نہیں کرتا، ترتیب سے چلیں گے، جتنی بات کر سکے کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

یہودیت

تاریخی پس منظر

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ تعارف ادیان و مذاہب کے حوالے سے ہم نے گزشتہ نشست میں بات شروع کی تھی۔ موجودہ تناظر میں عالمی طور پر ہمارا سب سے بڑا ٹکراؤ یہود سے ہے، تو آج ان کے حوالے سے بات ہوگی۔ یہودیت اس وقت تعداد کے لحاظ سے کوئی بڑا مذہب نہیں ہے تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہیں۔ لیکن اثر و رسوخ کے اعتبار سے، عالمی نظام میں مداخلت کے اعتبار سے، میڈیا اور معیشت پر کنٹرول کے حوالے سے یہودی اس وقت طاقتور ترین قوم ہیں۔ یہودیت کو سمجھنا اور پہچاننا ہمارے لیے بہت سے حوالوں سے ضروری ہے۔

ایک نسلی مذہب

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ نسلی مذہب ہے، حضرت یعقوبؑ کی اولاد سے ہیں، بنی اسرائیل کہلاتے ہیں، اور نسلی تفاخر کی بنیاد پر اپنے نسلی دائرے سے باہر نہیں نکلتے۔ ''نحن ابناء اللّٰہ واحبائہ'' (المائدہ ۱۸) جو قرآن کریم نے ان کے بارے میں کہا تھا وہ آج بھی ان کے عقائد اور ان کی نفسیات میں موجود ہے کہ ہم برتر قوم اور برتر نسل ہیں اور ہمیں دنیا پر حکمرانی کا حق حاصل ہے۔

عظیم تر اسرائیل کا ہدف

بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے۔ یہود کا ایک دور وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے جہانوں پر ان کی برتری کا اعلان فرمایا۔ ''وانی فضلتکم علی العالمین'' (البقرہ ۴۷) کہ اپنے دور میں تمام جہانوں پر اور تمام دنیا پر ان کو برتری حاصل تھی۔ بالاتری بھی حاصل تھی اور فضیلت بھی حاصل تھی۔ اس دور میں حضرت سلیمانؑ کی حکومت ''اسرائیل'' کہلاتی تھی، جس کے بارے میں خود حضرت سلیمانؑ نے فرمایا تھا ''قال رب اغفرلی وھب لی ملکاً لاینبغی لاحد من بعدی'' (ص ۳۵)۔ اس کا دائرہ ان کے دور میں جو تھا وہ آج کے یہودیوں کے نزدیک گریٹر اسرائیل (عظیم تر اسرائیل) کہلاتا ہے۔ آج کے

یہود کا ٹارگٹ اور نظریہ یہ ہے کہ ہم نے حضرت سلیمانؑ کے دور کا اسرائیل واپس لینا ہے، بحال کرنا ہے۔ گریٹر اسرائیل کا نقشہ نیٹ پر موجود ہے۔ ایک سانپ کی شکل میں سرحد کے ساتھ اس علاقے کو گھیرا ہوا ہے جس کو وہ گریٹر اسرائیل میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں مصر، سوڈان، عراق، اردن اور فلسطین اور سعودیہ آدھا شامل ہے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان سے وہ سرحد گزرتی ہے۔ مدینہ پر ان کا دعویٰ ہے، جبکہ مکہ ان کے دعوے سے خارج ہے۔

یہود کا کہنا یہ ہے کہ مسلمانوں نے ہمیں مدینہ سے نکالا تھا۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ، تینوں قبیلوں کو۔ اور خیبر میں ہماری حکومت تھی، مسلمانوں نے جنگ کے ذریعے ہمیں وہاں سے نکالا۔ یہ بات درست ہے کہ مسلمانوں کا خیبر پر قبضہ ہوا اور اس وقت یہودیوں نے مزارع کے طور پر خیبر میں رہنے کی اجازت مانگی، حضورؐ نے اجازت دے دی، پھر حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں انہیں خیبر سے جلاوطن کر دیا گیا۔ یہود کا کہنا ہے کہ مسلمانوں نے ہمیں مدینہ اور خیبر سے نکالا تھا اس لیے خیبر بھی ہمارا حصہ ہے اور مدینہ بھی ہمارا حصہ ہے۔ چنانچہ گریٹر اسرائیل کے نقشے میں مدینہ منورہ اور خیبر شامل ہیں۔ اور یہ ان کا اصل ٹارگٹ ہے کہ ہم نے قدیمی اسرائیل بحال کرنا ہے۔

عروج و زوال

قرآن کریم نے ان کے عروج کا دور بھی بیان فرمایا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کا دور، حضرت یوسفؑ کی بادشاہت، پھر حضرت موسیٰؑ کے ذریعے ان کی بادشاہت کی بحالی، بنی اسرائیل کا فرعون کے ظلم سے نجات حاصل کرنا، اور یوشع بن نونؑ کی قیادت میں بیت المقدس فتح کر کے اس کو دوبارہ اپنی ریاست بنانا، پھر حضرت طالوتؑ اور جالوت کی جنگ کا بھی قرآن کریم نے ذکر کیا ہے۔ اس جنگ میں ان کی فتح کے بعد حضرت داؤدؑ کی بادشاہت قائم ہوئی تھی، انہیں حضرت طالوتؑ نے اپنا جانشین بنایا تھا اور داماد بھی بنایا تھا۔ دوبارہ ریاست قائم ہوئی اور حضرت داؤدؑ کو اللہ تعالیٰ نے یہ ٹائٹل بھی دیا "یا داوود انا جعلناک خلیفة فی الارض فاحکم بین الناس بالحق" (ص ٢٦)۔ پھر حضرت داؤدؑ کی جانشینی حضرت سلیمانؑ کے حصہ میں آئی، اور وہ پھر عظیم تر سلطنت بنی جن کے سامنے یمن کی ملکہ سبا نے بھی سرنڈر کیا۔ یہ تو بنی اسرائیل کے عروج کا دور تھا، غلبے کا دور تھا، فضیلت کا دور تھا، قرآن کریم

کہتا ہے "وانی فضلتکم علی العالمین" (البقرہ ۴۷)۔

اس کے بعد یہود کے زوال کا دور شروع ہوا۔ ان کے زوال کے دور کا پہلا مرحلہ ہے جب حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے پہلے کے دور میں بخت نصر نے، جو بابل (عراق) کا حکمران تھا، اس نے یروشلم پر (بیت المقدس اور یروشلم ایک ہی شہر کے دو نام ہیں) پر حملہ کیا اور یہودیوں کا قتلِ عام کیا۔ ان کا عبادت خانہ ہیکل سلیمانی تباہ و برباد کر دیا، جڑ سے اکھاڑ کر پھینکا۔ جتنے لوگ قتل کر سکا قتل کیے، باقیوں کو لے گیا اور عراق میں قیدی بنا لیا۔ اور یہی بستی ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں "او کالذی مر علٰی قریة وھی خاویة علٰی عروشھا" (البقرہ ۲۵۹) میں آیا ہے۔ پھر حضرت عزیرؑ کی برکت سے ان کے ذریعے اس کی بحالی کا اہتمام کیا۔ ایران کے بادشاہ نے عراق کے خلاف ان کی مدد کی۔ اس وقت یہ دوبارہ بحال ہوئے اور یروشلم ان کے قبضے میں آیا۔ بیت المقدس دوبارہ تعمیر کیا، اپنے عبادت گاہ ہیکلِ سلیمانی دوبارہ تعمیر کیا۔ ان کی ریاست پھر ترقی پر آ گئی۔ اس کے بعد حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ ان میں ہی نبی گزرے۔ "اتیناھم الکتاب والحکم والنبوة" (الانعام ۸۹) اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو تین کتابیں بھی عطا فرمائیں۔ "وجعلکم ملوکا" (المائدہ ۲۰) ان کو بادشاہت دی اور حکومت بھی دی۔ یہ ان کا حق کا دور تھا، عروج کا دور تھا، اور دنیا پر ان کی دنیوی و دینی ہر اعتبار سے برتری کا دور تھا۔

حضرت عیسیٰؑ کے زمانے تک ان دور چلتا رہا۔ حضرت عیسیٰؑ نے جب اپنی نبوت اور وحی کا اعلان کیا تو یہود دو حصوں میں بٹ گئے، ایک حصہ ایمان لایا اور دوسرے حصے نے انکار کر دیا۔ اکثریت انکار کرنے والوں کی تھی، ایمان لانے والے تھوڑے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ ان کے جبر کا شکار ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے زندہ آسمانوں پر اٹھا لیا۔ یہ انہیں قتل نہیں کر سکے "وما قتلوہ وما صلبوہ ولٰکن شبہ لھم" (النساء ۱۵۷)۔ لیکن باقی مسیحی ان کے جبر کا شکار رہے، حتیٰ کہ روم عیسائیوں کے قبضے میں آ گیا اور بادشاہ طیطس رومی نے یروشلم پر حملہ کیا اور اسے یہودیوں سے چھین لیا، اس طرح یہ عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ طیطس رومی نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے ہیکل سلیمانی کو جڑ سے اکھاڑ دیا، موجود یہودی قتل کر دیے، باقیوں کو جلاوطن کر دیا اور یہودیوں کا داخلہ وہاں بند کر دیا۔ طیطس رومی

کے زمانے سے حضرت عمرؓ کی خلافت تک یہ کیفیت رہی کہ قبضہ عیسائیوں کا تھا، وہی سارا نظام چلا رہے تھے، یہودیوں کا وہاں آنے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا اور وہ دنیا بھر میں بکھرے ہوئے تھے۔

یہود مسلم کشمکش و معاملات

۶۳۸ء میں بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ

پھر حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمانوں کا بیت المقدس پر قبضہ ہوا۔ بیت المقدس کی اپنی تاریخ ہے، میں صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ مسلمانوں نے بیت المقدس عیسائیوں سے لیا تھا، پھر عیسائیوں نے ہم سے چھین لیا، نوے سال عیسائیوں کے پاس رہا، پھر صلاح الدین ایوبیؒ نے بیت المقدس کو آزاد کروایا۔ جب طیطس رومی نے یہودیوں کو بیت المقدس سے نکالا، یہودیوں کا اس وقت سے لے کر آج سے تقریباً ایک صدی پہلے تک بیت المقدس سے کوئی تعلق نہیں تھا، یہ دنیا بھر میں بکھرے ہوئے تھے۔ اور قرآن کریم نے جو بیان فرمایا ہے ”ضربت علیہم الذلۃ“ (آل عمران ۱۱۲) ان کی تقریباً اٹھارہ سو سال تک یہ کیفیت رہی ہے، اور کہیں ان کی کوئی ریاست نہیں تھی۔ ہمارے ساتھ ان کا معاملہ وہی ہے جو میں نے پہلے عرض کیا کہ ہم نے ان کے تین قبیلوں کو مدینہ سے نکالا، یہ سب خیبر میں اکٹھے ہو گئے تھے، پھر ان کو حضرت عمرؓ کے زمانے میں خیبر سے نکالا گیا، جلاوطن کیا گیا۔ مگر اس وقت سے لے کر آج سے ایک صدی پہلے تک یہودیوں سے ہمارا کوئی تنازعہ، کوئی جھگڑا، کوئی لڑائی، کوئی جنگ نہیں ہے۔ ان کا یہ سارا زمانہ عیسائیوں کے ساتھ دشمنی میں گزرا ہے، بلکہ طیطس رومی سے لے کر اب سے ایک صدی پہلے تک، ہٹلر تک، عیسائیوں اور یہودیوں میں شدید ترین دشمنی تھی۔ یہودی کمزور قوم تھی، عیسائی انہیں مارتے تھے، قتل کرتے تھے، جلاوطن کرتے، مال چھین لیتے تھے۔

مسلم ریاستیں، یہودیوں کی پناہ گاہیں

یہودیوں کی سب سے بڑی پناہ گاہ مسلمان ریاستیں ہوتی تھیں۔ خود یہودی مؤرخین اعتراف کرتے ہیں کہ ہمیں اچھی دو پناہ گاہیں میسر تھیں:

۱. اندلس میں مسلمانوں کی حکمرانی تھی، وہ ہماری پناہ گاہ تھی، وہاں ہمیں خرچہ اور تحفظ بھی مل جاتا تھا۔

۲. اور اس کے بعد خلافتِ عثمانیہ کے بارے میں غیر جانبدار اور معتدل یہودی مؤرخین اعتراف کرتے ہیں کہ وہ اپنے پورے دور میں یہود کی پناہ گاہ تھی۔ عیسائی ان کو اٹلی، برطانیہ، فرانس میں مارتے اور یہ قسطنطنیہ، ترکی میں آجاتے۔

ان کا آخری راؤنڈ ہٹلر والا ہے جسے ہولو کاسٹ کہتے ہیں، اس میں کچھ مبالغہ بھی ہے لیکن ہٹلر نے ان کی کٹائی کی ہے ابھی پون صدی پہلے۔ اللہ کی قدرت کہ ذلت اور مسکنت بھی دو ہزار سال یہودیوں کے حصے میں آئی، لیکن دولت بھی ان کے حصے میں آئی ہے۔ دنیا کے سب سے زیادہ مالدار ترین یہی رہے ہیں۔ البتہ مال و دولت کے باوجود ان کی حالت مسکنت کی رہی ہے۔ ایک صدی پہلے عیسائیوں سے انہوں نے مسلمانوں کے خلاف صلح کی تو تب ان کی حالت بدلنا شروع ہوئی۔ ہوا یوں کہ آج سے کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے یہودیوں نے اکٹھے ہو کر آپس میں فیصلہ کیا کہ کوئی صورت نکالو کہ فلسطین کی زمین، جو ہماری پرانی زمین تھی، جہاں سے ہمیں طیطس رومی نے نکالا تھا، وہاں واپس جا کر ہم آباد ہوں اور آبادی بڑھاتے بڑھاتے وہ مقام حاصل کریں کہ ہم بیت المقدس کا کنٹرول دوبارہ حاصل کر سکیں۔

بیت المقدس کیلئے حضرت عمرؓ کی اصلاحات

حضرت عمرؓ نے تو بیت المقدس کا قبضہ عیسائیوں سے لیا تھا، پھر عیسائیوں نے ہم سے لیا، پھر ہم نے دوبارہ عیسائیوں سے لیا، اور حضرت عمرؓ کے دور سے اب سے ایک صدی پہلے تک مسلمانوں کا کنٹرول رہا ہے۔

- حضرت عمرؓ نے ایک تبدیلی کی تھی کہ رومیوں کے زمانے میں ہیکلِ سلیمانی جو انبیاءؑ کی عبادت گاہ تھی، اس پر نفرت سے کوڑے کا ڈھیر لگا دیا گیا تھا اور وہاں گندگی پھینکی جاتی تھی، حضرت عمرؓ نے اس کی صفائی کروائی، خود اپنی چادر بچھا کر صفائی شروع کی اور سارا کوڑا اٹھایا کہ یہ انبیاء کرامؑ کی عبادت گاہ رہی ہے اور مقدس جگہ ہے۔
- دوسرا تاریخی کام حضرت عمرؓ نے یہ کیا کہ صفائی کر چکنے کے بعد ساتھیوں نے کہا کہ یہاں نماز

پڑھیں تو حضرت عمرؓ نے فرمایا، نہیں! میں یہاں نماز نہیں پڑھوں گا، اس لیے کہ اگر میں نے ایک نماز یہاں پڑھ لی تو تم نے اس بہانے اس پر قبضہ کر لینا ہے، یہ ہماری عبادت گاہ نہیں ہے، یہودیوں کی عبادت گاہ ہے، یہودیوں کی عبادت کا حق ہے، ہم الگ مسجد بنائیں گے، چنانچہ انہوں نے الگ مسجد بنائی۔

- اس کے ساتھ حضرت عمرؓ نے ان کا یہ حق بحال کر دیا کہ آکر عبادت کر سکتے ہیں، یہودیوں کو اجازت دے دی۔ یہودیوں کی وہاں "دیوارِ گریہ" معروف ہے، نیم گری ہوئی، نیم ثابت، قدیمی آثار میں سے ہے۔ اس کے ساتھ چمٹ کر روتے ہیں، اپنے پرانے دور کو یاد کرتے اور دعائیں کرتے ہیں۔ جیسے ہم بیت اللہ میں ملتزم کے ساتھ چمٹ کر عبادت کرتے اور روتے ہیں۔

ان کو حضرت عمرؓ نے آکر عبادت کی اجازت دے دی لیکن یروشلم کے نظام کا کنٹرول مسلمانوں کے پاس رہا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے سے خلافتِ عثمانیہ کے دور تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔

یہود اور خلافتِ عثمانیہ

ہمارے ہاں خلافت کی ترتیب یہ ہے:

۱. خلافتِ راشدہ،
۲. خلافتِ بنوامیہ،
۳. خلافتِ بنوعباس۔ پھر جب ہلاکو خان نے بغداد کو برباد کر دیا تھا اور آخری عباسی خلیفہ کو قتل کر دیا تھا، پھر ہم بکھرے تھے۔ اور مصر میں کچھ دن ہمارا فاطمی حکومت کے ذریعے تھوڑا سا اقتدار رہا۔
۴. اس کے بعد عثمانی کھڑے ہو گئے، انہوں نے اسلامی ریاست قائم کی، وہی ریاست بعد میں خلافتِ عثمانیہ کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ ان کا پہلا حکمران عثمان تھا، یہ سلطنت اس کے نام سے منسوب ہے نہ کہ حضرت عثمانؓ کے نام پر۔ سلطنتِ عثمانیہ نے خلافت کا ٹائٹل

استعمال کیا اور اس کے بعد صدیوں حکومت کرتے رہے اور اہلِ اسلام کے متفق علیہ خلافت رہی ہے۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس پر بھی اس کا کنٹرول تھا، خطبے میں ان کا نام پڑھا جاتا تھا، ان سے وفاداری کا اعلان ہوتا تھا۔ یہ الگ تاریخ ہے اور اہلِ اسلام کا خلافتِ عثمانیہ پر اعتماد واحترام اپنی جگہ پر ہے۔

فلسطین، خلافتِ عثمانیہ کا صوبہ

اس دوران فلسطین خلافتِ عثمانیہ کا صوبہ تھا۔ آج کے نقشے میں فلسطین اور اسرائیل دو الگ الگ ریاستیں دکھائی دیتی ہیں، یہ دونوں ملا کر اصل فلسطین تھا جو خلافتِ عثمانیہ کا صوبہ تھا۔ یہودیوں نے فیصلہ کیا کہ ہم نے وہاں جا کر آباد ہونا ہے اور اپنی آبادی بڑھا کر وہ ماحول پیدا کرنا ہے کہ ہم بیت المقدس کے معاملات میں دخیل ہو سکیں اور آہستہ آہستہ اس پر قبضہ کر لیں۔ اس وقت ترکی کی خلافتِ عثمانیہ سے ان کی کوئی لڑائی نہیں تھی۔ یہود کا وفد ترکی خلیفہ سلطان عبد الحمید ثانیؒ کے پاس آیا جو اپنے وقت کے بہت باوقار حکمران اور عالمی شخصیات میں سے تھے۔ قسطنطنیہ میں خلیفہ کا ہیڈ کوارٹر ''بابِ عالی'' کہلاتا تھا۔ بابِ عالی کو تقریباً تین صدیاں دنیا میں وہی پوزیشن حاصل رہی ہے جو اس وقت امریکی صدر کے وائٹ ہاؤس کو حاصل ہے کہ دنیا کے ہر معاملے میں دخل دینا اور کوئی معاملہ ان کی مرضی کے بغیر طے نہ ہونا اس کی پوزیشن رہی ہے۔ سلطان عبد الحمید ثانیؒ بڑے باحمیت حکمران تھے، انہوں نے اپنی یادداشتیں خود لکھی ہیں۔ ان کو بعد میں خلافت سے معزول کر کے نظر بند کر دیا گیا، اسی دوران ان کا انتقال ہوا۔ نظر بندی کے دوران انہوں نے یادداشتیں لکھیں جو ترکی میں تھیں، مجھے ایک عرصہ سے انتظار تھا پھر ان کا عربی ترجمہ ہوا تو میں نے منگوا کر پڑھیں۔ میرے پاس موجود ہے ''مذکرات السلطان عبد الحمید الثانیؒ'' کے عنوان سے۔ انہوں نے اس میں لکھا کہ میرے پاس یہودیوں کا عالمی وفد آیا۔

صہیونیت کیا ہے؟

یہ اصطلاح سمجھنا بھی ضروری ہے کہ صہیونیت کیا ہے۔ صہیون بیت المقدس کے ساتھ ایک پہاڑی ہے، حضرت داؤدؑ کی عبادت گاہ اس پہاڑی پر تھی۔ صہیون کو یہودیوں کے ہاں وہ تقدس

حاصل ہے جو ہمارے ہاں صفا اور مروہ کو ہے۔ اور اگر وہ حضرت داؤدؑ کی عبادت گاہ تھی تو اس کا تقدس ہمارے دلوں میں بھی ہے اور ہونا چاہیے۔ وہ خیمۂ داؤد کی نسبت حضرت داؤدؑ کی طرف کرتے ہیں۔ امریکہ کے صدر جمی کارٹر نے یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کا معاہدہ کروایا تھا۔ چند عرب ممالک نے اس معاہدے کو تسلیم کیا تھا۔ کیمپ ڈیوڈ (خیمۂ داؤد) کی جگہ بطور خاص منتخب کی تھی اور وہاں جا کر صلح نامے لکھے تھے۔ یہودیوں نے صہیون پہاڑی کے تقدس کے نام سے ایک تحریک شروع کی کہ ہم اس کے تقدس کو بحال کریں گے۔

یہودیوں کی فلسطین میں آبادکاری کے لیے درخواست

خلافتِ عثمانیہ کا قانون فلسطین کے حوالے سے یہ تھا کہ فلسطین میں یہودی بیت المقدس میں اپنی عبادت گاہ میں آ کر عبادت کر سکتے ہیں، کچھ دن اجازت نامے کے ساتھ رہ سکتے ہیں، لیکن یہاں زمین نہیں خرید سکتے، مکان نہیں بنا سکتے، یہاں کاروبار نہیں کر سکتے، مستقل رہائش اختیار نہیں کر سکتے۔ سلطان عبدالحمید ثانیؒ سے یہودیوں کا وفد ملا، ہرتزل اس کا لیڈر تھا، اس نے سلطان سے درخواست کی کہ ہمیں اجازت دی جائے کہ ہم تھوڑی بہت تعداد میں فلسطین میں آباد ہونا چاہتے ہیں۔ آپ اس قانون میں لچک پیدا کر کے ہمیں وہاں رہنے کی اجازت دیں۔ سلطان عبدالحمیدؒ کہتے ہیں میں نے انکار کر دیا کیونکہ ان کا سارا منصوبہ میرے ذہن میں تھا کہ یہ وہاں کرنا کیا چاہ رہے ہیں، ان کا پروگرام کیا ہے، کہتے ہیں میں نے انکار کر دیا۔

اگلے سال وہی وفد دوبارہ آیا اور اس بار پینترا بدلا۔ یہ بات آپ کے ذہن میں ہونی چاہیے کہ دنیا میں سائنسدانوں کی اکثریت یہودیوں کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم انٹرنیشنل سائنس یونیورسٹی بنانا چاہتے ہیں، سارے سائنسدانوں کو وہاں اکٹھا کریں گے، سائنس کی ترقی کے لیے ہم بڑا منصوبہ رکھتے ہیں، آپ ہماری سرپرستی فرمائیں اور ہمیں فلسطین میں جگہ دے دیں اور سہولیات فراہم کریں کہ ہم سائنس یونیورسٹی بنا سکیں۔ آپ کو بھی فائدہ ہوگا، ہمیں بھی فائدہ ہوگا۔ اور ہم آپ کی سپورٹ کے لیے تمام یہودی سائنسدانوں کو وہاں اکٹھا کر دیں گے۔ سلطان عبدالحمیدؒ نے کہا ٹھیک ہے، سائنس کی ترقی کی خاطر انٹرنیشنل سائنس یونیورسٹی کے لیے میں آپ کو جگہ بھی دوں گا، خرچہ بھی دوں گا، سپورٹ بھی کروں گا، پشت پناہی بھی کروں گا، لیکن اس شرط پر کہ وہ فلسطین میں نہیں ہوگی، فلسطین کے علاوہ دنیا

کے جس خطے میں آپ بنانا چاہیں میں مکمل تعاون کروں گا۔ اس پر وہ نہیں آئے کہ نہیں! ہمیں جگہ فلسطین میں ہی چاہیے۔

تیسرے سال پھر آئے اور اب ایک اور پیشکش کی۔ یہ سلطنتِ عثمانیہ کے زوال کے آغاز کا دور تھا، ہر چیز پر عروج کے بعد زوال کا دور ہوتا ہے۔ یہ خاصے مقروض ہو گئے تھے۔ یہود کی پیشکش یہ تھی کہ آپ کی سلطنت کے سارے خرچے ہم اٹھاتے ہیں، آپ کے قرضے ادا کریں گے، آپ فلسطین میں ہمیں مطلوبہ جگہ دے دیں۔ اب سلطان نے انہیں غصے سے نکال دیا اور کہا کہ آج کے بعد میں آپ سے ملاقات نہیں کروں گا اور مجھ سے آپ توقع نہ رکھیں کہ میں فلسطین میں آپ کو جگہ دوں گا۔ یہ تین سال مذاکرات ہوئے۔

یہ دور تھا ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۰ء کے درمیان کا۔ اس کے بعد سلطان عبدالحمیدؒ کے خلاف ترکی میں تحریک چلی اور پھر انہیں خلافت سے معزول کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ نظر بندی ہی میں خلیفہ نے یادداشتیں لکھیں اور نظر بندی ہی میں ان کی وفات ہوئی۔ پھر وہاں انقلاب آگیا، یہ تاریخ کا ایک الگ موضوع ہے۔

۱۹۱۷ء یہود اور برطانیہ کے درمیان ''بالفور معاہدہ''

سلطان عبدالحمید نے جب آخری جواب دے دیا تو یہود برطانیہ کے پاس گئے، انہوں نے مسلمانوں سے مایوس ہو کر فلسطین کو اپنا قومی وطن بنانے کے لیے برطانیہ سے رابطہ قائم کیا۔ برطانوی حکومت سے درخواست کی کہ ہم آپ سے صلح کے لیے تیار ہیں۔ یہ جنگِ عظیم اول کا دور تھا۔ ان سے کہا کہ ہم آپ کے جنگی اخراجات برداشت کریں گے، آپ فلسطین پر ہمارا حق تسلیم کریں اور یہ اعلان کریں کہ فلسطین یہودیوں کا قومی وطن ہے، اور ہم سے یہ وعدہ کریں کہ اگر اس جنگِ عظیم کے بعد فلسطین کا کنٹرول آپ کو حاصل ہوا تو ہمیں وہاں آباد کرنے اور اسے اپنا وطن اور ریاست بنانے کے لیے سہولتیں فراہم کریں گے۔ اس کے لیے ۱۹۱۷ء میں باقاعدہ معاہدہ ہوا جو ''بالفور ڈیکلیریشن'' کہلاتا ہے۔ برطانوی وزیر خارجہ آرتھر جیمز بالفور تھے، ان کے ساتھ معاہدہ ہوا۔ اس میں بالفور نے لکھا کہ ہم فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن تسلیم کرتے ہیں اور ان سے وعدہ کرتے ہیں کہ سلطنتِ عظمیٰ برطانیہ کو جب بھی موقع ملا ہم یہودیوں کو فلسطین میں بسانے اور ریاست قائم کرنے کے لیے سہولتیں فراہم

کریں گے۔ نیٹ پر یہ بالفور ڈیکلیریشن موجود ہے، پچھلے سال اس کا ایک سو سالہ جشن منایا گیا ہے۔

۱۹۱۷ء میں فلسطین پر برطانوی اتحاد کا قبضہ

جنگِ عظیم اول میں ایک طرف جرمنی تھا، دوسری طرف برطانیہ، اٹلی، فرانس وغیرہ سب کا متحدہ محاذ تھا۔ خلافتِ عثمانیہ اس جنگ میں جرمنی کے ساتھ تھی، جرمنی کو شکست ہوئی تو خلافتِ عثمانیہ کو بھی ہوگئی۔ متحدہ یورپی فوجوں نے جرمنی پر بھی قبضہ کر لیا اور خلافتِ عثمانیہ پر بھی کر لیا۔ ترکی کے مختلف علاقوں پر کسی حصے میں فرانس گھس گیا، کسی میں اٹلی اور کسی میں برطانیہ گھس گیا۔ جنگِ عظیم اول کے بعد جو بندر بانٹ ہوتی ہے کہ مفتوحہ علاقے کو قبضہ کرنے کی جنگ کے بعد فاتحین مفتوحہ علاقے آپس میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس تقسیم میں چونکہ برطانیہ نے پہلے سے یہودیوں سے وعدہ کر رکھا تھا تو برطانیہ نے کوشش کر کے فلسطین اپنے حصہ میں لے لیا۔ اس طرح ترکی کے پیچھے ہٹنے کے بعد فلسطین برطانیہ کی نوآبادی بن گیا۔ برطانوی گورنر وہاں بٹھا دیا گیا۔ یہ ۱۹۱۶ء، ۱۹۱۷ء کی بات ہے۔ اس کے بعد برطانیہ نے اعلان کر دیا کہ دنیا بھر سے جو یہودی یہاں آنا چاہیں، آجائیں، ہماری طرف سے اجازت ہے۔ وہ قانون کہ یہودی فلسطین کی زمین نہیں خرید سکتے منسوخ کر دیا اور اجازت دے دی کہ یہودی یہاں زمین خرید سکتے ہیں، یہاں کاروبار کر سکتے ہیں، مکان بنا سکتے ہیں، رہائش اختیار کر سکتے ہیں۔

۱۹۲۴ء میں ترکی سیکولر ملک بن گیا تھا، عربوں کی ریاستیں الگ الگ بن گئی تھیں، سعودیہ الگ، اردن الگ، عراق الگ۔ اب فلسطین بے یار و مددگار تھا، برطانیہ کے رحم و کرم پر تھا۔ برطانیہ نے یہودیوں کو بالفور معاہدے کے تحت فلسطین قومی وطن کے طور پر حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، اس کے لیے انتظامات ہوئے اور یہودی آنا شروع ہو گئے۔ جب برطانیہ نے قبضہ کیا تو بتایا یہ جاتا ہے، بلکہ میں کل ہی ایک پرانی دستاویز پڑھ رہا تھا، اس کے مطابق اس وقت فلسطین میں یہودیوں کی کل آبادی دو ہزار تھی۔ برطانوی سرپرستی میں مختلف علاقوں سے یہودی وہاں آکر آباد ہونا شروع ہوئے، زمینیں خرید کو مکان بناتے رہے، اور ایک علاقہ کو ٹارگٹ کر لیا تھا کہ ہم نے یہ علاقہ اپنی اکثریت کا علاقہ بنانا ہے۔ کراچی سے، بمبئی سے، روس سے، جرمنی سے یہودی اکٹھے ہوئے۔

فلسطینی زمین کی فروخت کے متعلق جید علماء کرام کا فتویٰ

اس دوران جب یہودی دنیا کے مختلف حصوں سے وہاں جاکر فلسطینیوں سے زمینیں خرید رہے تھے اور فلسطینی زمینیں بیچ رہے تھے، اس وقت فلسطین کے مفتی اعظم حضرت سید مفتی امین الحسینیؒ جوان تھے، صدر ایوب خان کے زمانے میں پاکستان بھی تشریف لائے ہیں، انہوں نے فتویٰ دیا تھا کہ فلسطین کی زمین یہودیوں پر بیچنا شرعاً جائز نہیں ہے کیونکہ یہ یہاں آباد ہوکر اپنی آبادی بناکر اور اپنی ریاست قائم کر کے بیت المقدس پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس فتوے کی تائید میں ہمارے بزرگوں نے بھی فتوے دیے۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کا فتویٰ "کفایت المفتی" میں موجود ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ نے مستقل کتابچہ لکھا اس پر جو اُن کی تصنیف "بوادر النوادر" کا حصہ ہے۔ انہوں نے بھی یہی بات کی کہ مفتی اعظم فلسطین ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لیکن قوموں کے اپنے اپنے مزاج ہوتے ہیں، فلسطینیوں نے فتوے کی پرواہ نہیں کی، البتہ فتوے کا اثر یہ ہوا کہ زمین کی قیمت تین چار گنا ہوگئی، یہودی خریدتے چلے گئے، فلسطینی بیچتے چلے گئے۔

ریاست اسرائیل

۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ کے ذریعے اسرائیلی ریاست کا قیام

فلسطین ۱۹۴۸ء تک برطانیہ کی نوآبادی رہا ہے۔ ۱۹۴۵ء میں جب اقوام متحدہ بنی تو برطانیہ نے دیکھا کہ فلسطین کے ایک حصے میں یہودیوں کی اتنی آبادی ہوگئی ہے کہ اگر ہم ریفرنڈم کروا کے ان کو وہ حصہ بطور ریاست دلوا دیں تو یہ ممکن ہے۔ برطانیہ نے اقوام متحدہ کو درخواست دے دی کہ میں فلسطین سے جانا چاہتا ہوں لیکن یہ چاہتا ہوں کہ ان کا مسئلہ حل کر دیا جائے، جس حصہ میں یہودی اکثریت ہے وہاں یہودی ریاست اسرائیل قائم کر دی جائے۔ چنانچہ اقوام متحدہ نے ۱۹۴۸ء میں فلسطین کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا:

۱۔ ایک حصہ اسرائیل

۲. دوسرا حصہ فلسطین

۳. تیسرا حصہ بیت المقدس۔

اقوام متحدہ کی تقسیم میں فلسطین یہودیوں کو دے دیا گیا، اور چونکہ فلسطین پر عیسائیوں کا اپنا دعویٰ بھی تھا، تو بیت المقدس (یروشلم) کو اس سے الگ رکھا۔ بیت المقدس نہ یہودیوں کو دیا، نہ مسلمانوں کو دیا، اسے عارضی طور پر اردن کے کنٹرول میں دے دیا، یہ کہہ کر کہ اس کا فیصلہ بعد میں بین الاقوامی سطح پر کریں گے۔ اور بعد میں فیصلہ کرنے کے حوالے سے عیسائی قیادت کا ذہن یہ ہے کہ وہاں تینوں مذاہب کی مشترکہ کمیٹی قائم کر کے اس کا کنٹرول اس کو دے دیا جائے۔ جو اسرائیل کا باضابطہ نقشہ ہے، اس میں بیت المقدس اسرائیل کا حصہ نہیں ہے، اردن کا حصہ ہے۔

بیت المقدس کے دعویدار مذاہب

۱. بیت المقدس پر عیسائی بھی دعویدار ہیں بیت اللحم کے حوالے سے ہے۔ بیت اللحم سے مراد "مکاناً شرقیا" (مریم ١٦) جہاں حضرت عیسیٰؑ کی ولادت ہوئی۔ یہ بیت المقدس سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، یہ عیسائیوں کا قبلہ ہے۔

۲. مسلمانوں کا بھی دعویٰ ہے مسجد اقصیٰ کے حوالے سے۔ یہ جو سنہرا گنبد دکھایا جاتا ہے یہ مسجد صخرہ کہلاتی ہے، مسجد اقصیٰ الگ ہے۔

۳. اور یہودیوں کا دعویٰ ہے ہیکلِ سلیمانی کے حوالے سے ہے۔

تین قوموں کا فلسطین پر دعویٰ ہے اور یہ تینوں جگہیں الگ الگ ہیں۔

۴. بلکہ آپ کے علم میں ہونا چاہیے کہ ایک چوتھی قوم کا دعویٰ بھی فلسطین پر ہے، بہائیوں کا۔ جو مرزا بہاء اللہ شیرازی اور محمد علی الباب کے پیرو ہیں، اور قادیانیوں کے ساتھ ساتھ یہ ایران میں مستقل مذہب چل رہا ہے اور وہ دنیا بھر میں موجود ہیں۔ بہائیوں کا قبلہ "عکہ" ہے جو کہ فلسطین میں ہے۔ جب ایرانیوں نے انہیں نکالا تو بہاء اللہ شیرازی وہاں جا کر آباد ہو گئے۔ ان کی قبر بھی وہیں ہے، ان کے بیٹے عبد البہاء بھی وہیں ان کے جانشین بنے۔ بہائی کمزور نہیں ہیں، تعداد میں تھوڑے ہیں لیکن بااثر ہیں۔ اس وقت جو فلسطین کے باضابطہ صدر ہیں محمود عباس، یہ بہائی ہیں۔

چنانچہ چار قوموں کے قبلے ہیں فلسطین میں۔

۱۹۶۷ء میں اسرائیل کا بیت المقدس پر قبضہ

جب اسرائیل بنا تو اسرائیل کو یورپی ممالک، امریکہ اور روس نے تسلیم کیا، اسے سپورٹ کیا، ریاست بنوائی، اسباب مہیا کیے، اس کو مستحکم کیا۔ بعد میں ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کی تین ملکوں مصر، شام اور اردن کے ساتھ بیک وقت جنگ ہوئی۔ یہ میرے طالبعلمی کے زمانہ کی بات ہے، میں بھی جلوس وغیرہ نکالنے میں شامل تھا جمعیت طلبہ اسلام کے نام سے۔ اس جنگ میں اسرائیل نے تینوں ملکوں کو شکست دے کر

۱. مصر کے صحرائے سینا پر قبضہ کر لیا،
۲. شام کی گولان پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا،
۳. اور اردن کے یروشلم (بیت المقدس) پر قبضہ کر لیا۔

تب سے بیت المقدس اسرائیل کے قبضے میں ہے جو کہ اردن کے ساتھ ہی ہے، عمان سے تین چار گھنٹے کی ڈرائیو ہے۔ اسرائیل نے قبضہ کر کے اس کو اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ اس کے بعد مصر نے تو اپنا علاقہ جنگ کر کے چھڑوا لیا لیکن شام کے مقبوضات اور یروشلم ابھی تک اسرائیل کے قبضے میں ہیں۔

اس وقت موجودہ صورتحال یہ ہے کہ ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ نے جو سرحدیں طے کی تھیں اس کے مطابق اسرائیل الگ تھا، فلسطین الگ، اور یروشلم الگ تھا۔ اسرائیل کے ۱۹۶۷ء کے قبضے کو عالمی برادری تسلیم نہیں کر رہی۔ بیت المقدس متنازعہ سمجھا جا رہا ہے، اقوام متحدہ بھی اسے متنازعہ ہی کہتی ہے، اس کا فیصلہ ہونا باقی ہے۔ اس دوران اسرائیل نے اسے دارالحکومت قرار دینے کا اعلان کر دیا کہ بیت المقدس ہمارا دارالحکومت ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ملکوں کے سفارت خانے دارالحکومت میں ہوتے ہیں، عالمِ اسلام نے احتجاج کیا اور کہا کہ جو ملک بھی اپنا سفارت خانہ وہاں لے جائے گا ہم اس کے بارے میں پالیسی طے کریں گے کہ اس کا ہمارے ساتھ کیا تعلق ہے، اس لیے بہت سے ملک ہچکچاتے رہے ہیں۔

امریکہ، اسرائیل کا سب سے بڑا سہارا

امریکہ اسرائیل کے ساتھ ہے لیکن اس بارے میں ہچکچاتا رہا، لیکن اب امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ صاحب نے اعلان کر دیا ہے کہ ہم اپنا سفارت خانہ یروشلم میں منتقل کریں گے۔ سفارت خانہ یروشلم میں منتقل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بیت المقدس کو اسرائیل کا باضابطہ دارالحکومت تسلیم کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ بین الاقوامی معاہدات میں متنازعہ ہے اور عالمِ اسلام کے ہاں بھی متنازعہ ہے بلکہ ہمارے نزدیک تو پورا فلسطین متنازعہ ہے۔ تو اب ٹرمپ کے اعلان سے یہ ایک نیا جھگڑا کھڑا ہو گیا ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ رب العزت نے یہود کے بارے میں قرآن مجید میں بیسیوں باتیں فرمائی ہیں، ان میں سے ایک کا حوالہ میں نے دیا تھا کہ اللہ رب العزت نے فرمایا "ضربت علیهم الذلة این ما ثقفوا الی بحبل من الله و حبل من الناس" (آل عمران ۱۱۲)۔ اللہ کی رسی، جس کی تفصیل مفسرین یوں فرماتے ہیں کہ دینِ اسلام قبول کر لیں۔ لوگوں کی رسی سے مراد یہ کہ لوگوں کی کوئی بڑی طاقت ان کا سہارا بن جائے۔ "بحبل من الناس" کا منظر آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ امریکہ یہودیوں کا سب سے بڑا سہارا بنا ہوا ہے، اور اس حد تک سہارا بنا ہوا ہے کہ پوری دنیا کی اجتماعی رائے کو رد کر کے امریکہ کا صدر ٹرمپ یہودیوں کی حمایت میں اور بیت المقدس پر یہودیوں کا استحقاق جتانے کے لیے بڑی مضبوطی کے ساتھ کھڑا ہے۔ اور گزشتہ روز اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ان کے سفیر نے جو تقریر کی ہے وہ آپ نے پڑھ لی ہو گی۔ ایک تو اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں یہ فرمایا تھا کہ یہودیوں کو عزت نصیب نہیں ہو گی سوائے دو طریقوں کے "بحبل من الله" یا "بحبل من الناس"۔ آج پوری دنیا کی اجتماعی رائے اس بات کو تسلیم نہیں کر رہی کہ بیت المقدس اسرائیل کا حصہ ہے لیکن "بحبل من الناس" کی سب سے بڑی علامت صدر ڈونلڈ ٹرمپ ہیں جو اسرائیلیوں کے ساتھ کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہم ہر قیمت پر یہ کریں گے۔

ایک اور بات اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں سورہ بنی اسرائیل کے آغاز میں فرمائی ہے "لتفسدن فی الارض مرتین ولتعلن علوًا کبیرًا" (الاسراء ٤) کہ ہم نے بنی اسرائیل کو یہ کہہ دیا تھا، تورات میں لکھ دیا تھا کہ تم دو دفعہ بڑے فساد کرو گے اور دو دفعہ دنیا پر اپنی چوہدراہٹ جتانے کی

کوشش کرو گے، اور ہم دونوں دفعہ تمہیں سزا دیں گے۔ یہ دونوں واقعات گزر چکے ہیں۔ پہلی دفعہ اللہ تعالٰی نے ان کو سزا دی بخت نصر کے ذریعے ''بعثنا علیکم عبادًا لنا اولی باس شدید فجاسوا خلال الدیار'' (الاسراء ۵)۔ دوسری دفعہ ان کو سزا دی طیطس رومی کے ذریعے جس نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالٰی نے ایک بات اور بھی فرمائی ہے ''و ان عدتم عدنا'' (الاسراء ۸) اگر تم دوبارہ اپنی انہی حرکات پر لوٹو گے تو ہم بھی تمہیں وہی سزا دیں گے۔ تاریخ کے ایک طالبعلم کے طور پر میں سمجھتا ہوں، میرا اندازہ ہے، میں یقینی بات نہیں کر رہا کہ اب ''ان عدتم عدنا'' کا ماحول پیدا ہو رہا ہے، یہودی دنیا میں دوبارہ اکٹھے ہو رہے ہیں بلکہ اکٹھے ہو چکے ہیں، اور یہود ایک طرف ہیں باقی دنیا دوسری طرف ہے، اور پورے عالمِ اسلام کے مسلمانوں کے یہود کی حرکتوں کے حوالے سے جذبات آپ کے سامنے ہیں۔

عیسائی یہود گٹھ جوڑ

میں اس پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں، والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نے جب علاماتِ قیامت پر یہ حدیث پڑھی کہ یہودیوں کے ساتھ تمہاری جنگیں ہوں گی، والد محترم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے استاذ محترم سے سوال کیا تھا کہ یہودی تو دنیا میں کہیں بھی اکٹھے نہیں ہیں، ان کی کہیں ایک ریاست بھی نہیں ہے، اور ہم جیسے تیسے بھی ہیں بہرحال ہماری ریاستیں ہیں، قومیں ہیں، ملک ہیں، علاقے ہیں۔ یہودیوں کی ہم سے لڑائیاں کیسے ہوں گی؟ تو استاد محترم نے کہا تھا کہ بات تو سمجھ میں نہیں آتی لیکن ایسے ہی ہو گا کیونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے تو ہمارا ایمان ہے کہ ایسے ہو گا۔ والد گرامی فرماتے تھے کہ جو بات ہمیں سمجھ نہیں آتی تھی وہ ہم نے اپنی آنکھوں سے ہوتی دیکھی کہ دنیا بھر سے یہودی ایک جگہ اکٹھے ہو رہے ہیں اور بڑی تعداد اکٹھی ہو چکی ہے اور ساری دنیا سے جنگ چھیڑے ہوئے ہیں۔

اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ''ان عدتم عدنا'' کی تیاری کے مراحل ہیں کہ یہودی دوبارہ جمع ہو رہے ہیں، ساری دنیا کے خلاف محاذ آرائی کیے ہوئے ہیں، اور حالات اس طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس میں ہمارے لیے بھی بہت آزمائش کی باتیں ہیں، دجال کا ظہور وغیرہ، ابھی بہت سی علامات باقی

ہیں۔

آج سے سو سال پہلے یہود کی یہ کیفیت نہیں تھی جو آج ہے۔ خیبر سے جلاوطنی سے لے کر آج سے سو سال پہلے تک یہود کا مسلمانوں کے ساتھ کہیں کوئی تنازعہ، لڑائی نہیں تھی۔ عیسائیوں کے ساتھ ان کے تنازعات تھے اور ہم انہیں پناہ دیا کرتے تھے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے "لتجدن اشد الناس عداوة للذين امنوا اليهود والذين اشركوا" (المائدہ ۸۲) کہ پوری نسلِ انسانیت میں مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن یہودی ہیں۔ اب منظر یہ ہے کہ یہودی اور عیسائی اکٹھے ہو گئے ہیں، دماغ یہود کا ہے، یہود کے پاس پیسے ہیں، باقی وسائل واسباب عیسائیوں کے ہیں۔ یہود نے آج سے دو صدیاں قبل پہلے پروٹوکول کے نام سے جو منصوبہ بندی کی تھی وہ بتدریج آگے بڑھ رہی ہے، اس کے دو مظاہر میں عرض کرنا چاہوں گا۔

طاقت کا عالمی توازن

اس وقت امریکہ سب سے بڑی طاقت ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ ظاہری اعتبار سے، مادی اعتبار سے، عسکری اعتبار سے اور سیاسی اعتبار سے امریکہ دنیا کی سب سے بڑی قوت ہے اور اس کے دعوے کو کوئی بھی چیلنج نہیں کر رہا۔ افغانستان کے جہاد تک دنیا میں دو بڑی قوتیں شمار کی جاتی تھیں: امریکہ اور روس۔ ان کے درمیان سرد جنگ (کولڈ وار) انیسویں صدی تک رہی ہے۔ افغانستان کی جنگ کے خاتمے پر امریکہ نے نیو ورلڈ آرڈر کے نام سے یہ اعلان کیا کہ اب وہ واحد عالمی سپر پاور ہے، یک قطبی طاقت ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ یہ بات فطرت کے خلاف ہے۔ دنیا میں کبھی یک قطبی طاقت نہیں رہی، اللہ تبارک وتعالیٰ کا سوسائٹی میں یہ نظام چلا آ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ بیلنس رکھتے ہیں، فرمایا "ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع وصلوات ومساجد يذكر فيها اسم الله كثيرًا" (الحج ۴۰)۔ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ میں لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے روکتا رہتا ہوں، ایک طاقت بڑھتی ہے تو مقابلے میں دوسری طاقت آ جاتی ہے۔ افغانستان کی جنگ کے خاتمے تک صورتحال یہ رہی ہے کہ دو طاقتیں آمنے سامنے تھیں۔ یورپ کے سامنے ہٹلر تھا، بعد میں امریکہ

اور مغربی طاقتوں کے سامنے روس آکھڑا ہوا تھا اور امریکہ اور روس کے مابین سرد جنگ چلتی رہی ہے۔

جب افغانستان کی جنگ عروج پر تھی اور امریکہ اس کی سپورٹ میں آگیا تھا تو یہ نظر آرہا تھا کہ افغانستان اور پاکستان کے مجاہدین کی قربانیاں اور اس کی پشت پر امریکہ کی طاقت سے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ روس شکست کھائے گا، اور پھر اس نے شکست کھائی بھی۔ اس وقت ہمارے بعض اہلِ علم دانشور حضرات نے یہ کہا، خود مجھ سے ہمارے بعض اساتذہ نے بات کی کہ یہ جو کچھ ہورہا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ امریکہ کے مقابلے میں روس کی طاقت درمیان سے ہٹ جائے گی اور امریکہ یک قطبی طاقت ہوگا۔ اور پھر وہی ہوگا جو امریکہ چاہے گا، اس کا کوئی سامنا کرنے والا نہیں ہوگا۔

یہ بات درست تھی کہ جب دو طاقتیں آمنے سامنے تھیں تو دنیا کے ہر ملک کو سہارا تھا کہ امریکہ کا کیمپ زیادتی کرتا تو روس کا کیمپ پناہ دینے کے لیے موجود تھا، اور اگر روس کا کیمپ زیادتی کرتا تو امریکہ کا کیمپ پناہ دینے کے لیے موجود تھا۔ خود مشرق وسطیٰ میں یہ دونوں کیمپ موجود تھے جو توازن کا کردار ادا کر رہے تھے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ افغانستان کی جنگ ٹھیک نہیں تھی، وہ تو ٹھیک تھی، لیکن ہر جنگ کے کچھ مثبت نتائج ہوتے ہیں کچھ منفی بھی ہوتے ہیں۔ افغانستان کی جنگ کے خاتمے پر عالمی طاقت کا توازن بگڑ گیا اور امریکہ واحد طاقت رہ گئی، ابھی تک امریکہ کو چیلنج کرنے والا سامنے کوئی نہیں ہے۔ لیکن یہ ماحول زیادہ دیر رہے گا نہیں کیونکہ فطرت کے خلاف ہے، البتہ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ امریکہ یک قطبی طاقت ہے اور کوئی طاقت اس کے سامنے کھڑا ہونے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔

دورِ حاضر میں یہود کا کردار

موجودہ صورتحال میں یہود کا کردار کیا ہے؟ میں یہ عرض کرنا چاہ رہا ہوں کہ یہود کے کردار کو سمجھنے کے لیے امریکہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ امریکہ کی اصل آبادی کو ریڈ انڈین کہہ کر انہوں نے کناروں پر لگا دیا ہے۔ اسپین میں جب مسلمانوں کو شکست ہوئی، اس وقت اسپین کی ملکہ ازابیلہ کے کہنے پر کولمبس وغیرہ دنیا میں سیاحت کرتے ہوئے سمندر میں سفر کر کے دوسرے کنارے تلاش کر رہے تھے، اسی میں امریکہ دریافت ہوا جو بہت بڑا برِاعظم ہے۔ اس میں امریکہ، کینیڈا، میکسیکو، برازیل،

جنوبی امریکہ اور شمالی امریکہ سب شامل ہیں۔ اب جو امریکہ کی موجودہ آبادی ہے یہ یورپ، جرمن، اسپین، فرانس اور برطانیہ وغیرہ سے گئے ہوئے لوگ ہیں جنہوں نے امریکہ کو آباد کیا تھا۔ یہ پہلے وہاں کی لوکل آبادی سے کام لیتے رہے، پھر افریقہ سے ملازم اور غلام بھرتی کر کے لے جاتے رہے۔ امریکہ کو آباد کیا، اسے ترقی دی، اسے آرگنائز کیا، اسے سماجی بھلائی، تمدن و تہذیب سب کچھ فراہم کیا۔ اس وقت بھی آپ کو امریکہ میں مختلف نسلوں کے لوگ ملیں گے اور بہت سے ملکوں کے شہروں کے نام بھی وہ اپنے ساتھ لے گئے مثلاً برنگھم وغیرہ۔ امریکہ میں اسپینش سب سے زیادہ ہیں اور انگلش کے ساتھ اسپینش زبان امریکہ کی دوسری سرکاری زبان ہے۔ یہ اسپین کے لوگ تھے جو اسپین سے بھاگے تھے وہ وہاں جا کر آباد ہوئے۔ اسپینش جو وہاں آباد ہیں ان کی ایک بڑی تعداد مسلمانوں کی اولاد ہے۔

امریکہ اور یورپ میں اثر و رسوخ

جب امریکہ میں مختلف ممالک سے لوگ جا کر آباد ہونے لگے، یہود نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور امریکہ میں آباد ہونا شروع ہو گئے، اور صرف آباد ہونا شروع نہیں ہوئے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کی کشمکش آج سے سو سال پہلے تک قائم تھی، عیسائی سیاست دان اور عیسائی علماء بھی یہود کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی حیثیت ایک اقلیت کی تھی، ایسی اقلیت جس کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ امریکہ میں یہودیت کے ارتقا کی تاریخ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔ انہوں نے وہاں نئے برِاعظم میں آباد ہو کر نئے سرے سے منصوبہ بندی کی، نئی صف بندی کی۔ تعلیم، سائنس، معیشت اور تجارت کے راستوں سے یہود نے وہاں اپنا اثر و رسوخ قائم کیا اور ایک منظم پلان کے ساتھ آہستہ آہستہ وہاں کے کلیدی مناصب پر، کلیدی شعبوں میں اپنا کنٹرول قائم کیا۔ اس وقت بقول اقبالؒ

فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے

یورپ میں بھی انہوں نے ایسے ہی کیا، محاذ آرائی بالکل چھوڑ دی اور خفیہ خفیہ تعلیمی شعبے میں آگے آ گئے۔ معیشت میں ان کی ہمیشہ سے بالادستی رہی ہے اور ان کا دماغ بھی بہت کام کرتا ہے۔ ان کے سازشی دماغ کو سمجھنا ہو تو اس کے لیے قرآن کریم نے ان کے جو گزشتہ واقعات بیان کیے ہیں وہی کافی ہیں۔ آہستہ آہستہ انہوں نے یورپ اور امریکہ دونوں برِاعظموں میں اپنا اثر و رسوخ بنانا شروع کیا۔

یورپ میں تو یہ ایک حد تک ہیں، یورپ پوری طرح ان کے ساتھ نہیں ہے اور اس کا کنٹرول ان کے پاس ایک حد سے زیادہ نہیں۔ لیکن امریکہ میں یہ مکمل کنٹرول حاصل کر چکے ہیں۔ امریکہ کے تھنک ٹینکس میں، امریکہ کی سیاسی قیادت، معاشی قیادت، امریکہ کے بینکنگ کے نظام میں نوے فیصد کنٹرول یہود کا ہے۔ پالیسی سازی کے مراکز تک رسائی حاصل کرنا اور کنٹرول حاصل کرنا، یہ یہودیوں کی تکنیک رہی ہے۔

یہودیوں اور قادیانیوں میں مماثلت

اور یہاں میں یہ بات یاد دلانا چاہوں گا کہ یہ بات علامہ اقبال مرحوم نے قادیانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے اسی پس منظر میں کی تھی۔ قادیانیوں کا جو طریقہ انگریزوں کے دور میں تھا کہ اعلٰی مناصب تک پہنچ کر اعلٰی محکموں میں رسوخ حاصل کر کے کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ انگریزوں کے دور سے ان کی یہ تکنیک چلی آ رہی تھی۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک نے قادیانیوں کو بریک لگائی۔ اقبالؒ نے اسی پس منظر میں کہا تھا کہ قادیانیت یہودیت کا چربہ ہے۔ اس وقت امریکہ میں یہود کی آبادی بمشکل ایک یا ڈیڑھ فیصد ہو گی لیکن امریکہ کی پالیسیوں پر کنٹرول یہود کا ہے، جس کی ایک بات تو میں نے اقبالؒ کے حوالے سے ذکر کی ہے۔

دوسرے میں یہ ذکر کرنا چاہوں گا کہ جب ۱۹۷۴ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی وزارتِ عظمٰی کے دور میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا تو بھٹو مرحوم اپنے اس فیصلے کے دفاع میں جو باتیں کہا کرتے تھے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے جیل میں اپنے نگران کرنل رفیع سے کہا کہ احمدی پاکستان میں وہی پوزیشن حاصل کرنا چاہتے ہیں جو امریکہ میں یہودیوں کو حاصل ہے۔ آگے وضاحت کی کہ ملک کی کوئی پالیسی ان کی مرضی کے بغیر طے نہ ہونے پائے۔ بھٹو مرحوم نے کہا تھا کم از کم میں تو یہ نہیں ہونے دوں گا کہ پاکستان کی پالیسیوں کا کنٹرول ایک اقلیتی گروہ کے ہاتھ میں چلا جائے۔ فرق یہ ہوا کہ

- یہودیوں کے راستے میں کوئی مزاحمت نہیں تھی، عیسائی علماء نے مزاحمت کی کوئی قوت کھڑی نہیں کی، اور یہودی مزاحمت کے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے اور تقریبًا ایک صدی میں انہوں نے امریکہ کے معاملات کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔
- جبکہ قادیانیوں کو مزاحمت کا سامنا تھا، اگر قادیانیوں کو ۱۹۵۳ء کی تحریک کی مزاحمت کا سامنا نہ

ہوتا، آج بھی اگر انہیں مزاحمت کا سامنا نہ ہو تو قادیانی اپنی تمام تر ناکامیوں کے باوجود اس پوزیشن میں ہیں کہ وہ تھوڑے سے عرصے میں پاکستان میں وہ پوزیشن حاصل کر سکتے ہیں جو امریکہ میں یہودیوں کو حاصل ہے، اسی لیے وہ ان رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

یہود کا ہدف

خیر یہودیوں نے امریکہ پر کنٹرول حاصل کر لیا، امریکہ کی پالیسیاں یہود کے اشارے پر چلتی ہیں، یعنی اس وقت یہود کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ امریکہ کو چلا رہے ہیں اور امریکہ باقی دنیا کو چلا رہا ہے۔

- یہود کی اس تگ و دو کے پیچھے ایک تو ان کا وہ پرانا خواب ہے کہ فلسطین ان کا وطن ہے انہوں نے واپس لینا ہے، یروشلم کو دوبارہ قبضے میں لینا ہے، ہیکلِ سلیمانی دوبارہ تعمیر کرنا ہے اور اسرائیل کو بحال کرنا ہے، حضرت سلیمانؑ کے زمانے کی اسرائیلی ریاست کو دوبارہ قائم کرنا ہے۔
- دوسرے یہ کہ یہودیت نسلی مذہب ہے صرف بنی اسرائیل کے لیے ہے، ان کی نسلی برتری کے احساس کا ذکر قرآن کریم نے بھی متعدّد مقامات پر کیا ہے۔

جناب رسول اللہ اور یہود و نصاریٰ کا حسد

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے میں یہود اور عیسائیوں کو جو رکاوٹ تھی وہ نہ پہچاننا نہیں تھی، بلکہ وہ آپؐ کو پہچانتے تھے ''الذین اتیناھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابنائھم'' (البقرہ ۱۴۶) پھر ان کے انکار کی وجہ کیا بنی؟ قرآن مجید میں ہے ''حسدًا من عند انفسھم من بعد ما تبین لھم الحق'' (البقرہ ۱۰۹)۔ ان کے انکار کی بڑی وجہ حسد تھی۔ حسد اس بات پر کہ یہ نبیؐ بنی اسرائیل میں کیوں نہیں آئے، بنی اسماعیل میں کیوں آئے ہیں۔ جس کو پنجابی زبان میں ہم ''شریکا'' کہتے ہیں کہ چچا زاد بھائیوں میں کیوں آئے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے ''قالوا نؤمن بما انزل علینا ویکفرون بما ورآئہ'' (البقرہ ۹۱)۔ بنی اسرائیل سے ہٹ کر ہر وحی کا انکار کرتے ہیں، یہ ان کی نسلی برتری اور فوقیت کا احساس تھا جس کی بنیاد حسد ہے۔

عیسائیوں میں بھی یہی بات تھی، اس وقت میں حوالے کے لیے بخاری شریف کی ایک روایت کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ قیصرِ روم کے سامنے جب جناب نبی کریمؐ کا گرامی نامہ پیش ہوا اور قیصرِ روم نے جناب ابوسفیان سے، جو اس علاقے میں آئے ہوئے تھے، بلا کر جناب نبی کریمؐ کے بارے میں طویل انٹرویو کیا تھا، وہ بڑا دلچسپ مکالمہ ہے۔ حضورؐ کی ذات و قوم، آپ کے اخلاق اور آپ کی دعوت کے بارے میں سوالات کیے تھے۔ ابوسفیان جواب دیتے گئے، آخر میں اس نے کہا تھا کہ میں بھی نبی آخر الزمان کے انتظار میں ہوں، لگتا ہے کہ یہ وہی ہیں۔ اور جناب ابوسفیانؓ سے کہا تھا جو تم کہہ رہے ہو اگر یہ درست باتیں ہیں تو ''انہ لنبی'' بے شک وہ نبی ہیں۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، ان کے پاؤں اپنے ہاتھوں سے دھوتا، لیکن مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ تم بدوؤں میں آ جائے گا۔ چنانچہ یہ بات اس کے ایمان لانے میں رکاوٹ بنی۔ یہود کے راستے میں بھی یہی نسلی حسد رکاوٹ بنا۔

دنیا پر غلبے کا ایجنڈا

چنانچہ اس وقت یہود کا ایجنڈا صرف اسرائیل قائم کرنے کا نہیں ہے، وہ تو ہے ہی، ساتھ ہی اسرائیل قائم کر کے دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کا ایجنڈا بھی ہے۔ اس بنیاد پر کہ ''نحن ابناء اللّٰہ واحبائہ'' (المائدہ ۱۸)۔ ان کا عقیدہ ہے کہ بنی اسرائیل برتر نسل ہیں اور ان کو نسلی بنیاد پر دنیا پر حکمرانی کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ دنیا اسرائیل کو ایک نسلی مذہب کہتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب جنوبی افریقہ میں گوروں کی حکومت نسلی بنیاد پر تھی۔ گوروں نے قبضہ کیا ہوا تھا اور وہ کالوں کو قریب نہیں آنے دیتے تھے۔ اور اقوام متحدہ کے کاغذات میں، بین الاقوامی برادری کے کاغذات میں بھی، جنوبی افریقہ اور اسرائیل کو نسل پرست ریاستیں کہا جاتا تھا۔ اب تو جنوبی افریقہ بدل گیا ہے، وہاں حکومت تبدیل ہو گئی، اب وہ دور ختم ہوا اور اب سیاہ فام اکثریت کی حکومت ہے۔ لیکن اسرائیل ابھی تک اسی نسلی برتری میں ہے۔

تو میں نے دو باتیں عرض کی ہیں کہ

۱. یہودی حضرت سلیمانؑ کی ریاست اسرائیل کے قیام کے لیے کوشاں ہیں،

۲. اور دوسرے یہ کہ یہود نسلی برتری کے خبط کا شکار ہیں اور پوری دنیا پر عالمی قیادت اور کنٹرول کے دعویدار ہیں۔

ان کا طریقۂ واردات یہ ہے کہ چونکہ خود ان کے اپنے پاس طاقت نہیں ہے، انہوں نے پہلے ہمیں استعمال کرنے کی کوشش کی تھی، سلطان عبد الحمید ثانیؒ کے ساتھ ان کے مذاکرات اور پیشکشیں ہوئیں۔ سلطان ساری بات کو سمجھتے تھے اس لیے ان کے قابو نہیں آئے۔ جبکہ برطانوی حکومت کے ذریعے، جو اس وقت سب سے بڑی مسیحی قوت تھی، عیسائی ان کے قابو آ گئے۔ انہوں نے ساری پلاننگ کر کے عیسائی وسائل کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنا شروع کیا۔ مختصر طور پر خلاصہ بات کا یہ ہے کہ یہودی دماغ اور عیسائی وسائل مسلمانوں کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں اور اس وقت عالمِ اسلام اور اسلام ان کا ٹارگٹ ہے۔ جہادِ افغانستان کے مکمل ہونے پر، روس کے شکست کھانے پر امریکہ اور روس کے درمیان محاذ آرائی کا ماحول ختم ہو گیا تھا۔ اب روس طاقت ہے لیکن سامنے کی طاقت نہیں ہے، یہ امریکہ کو کسی معاملے میں چیلنج نہیں کر رہا۔ نیٹو کے سیکرٹری نے افغانستان کی جنگ کے خاتمے پر کہا تھا، ایک حریف ہمارے راستے سے ہٹا ہے، اسلام ابھی باقی ہے۔ یہودی اسلام کو مغرب سے لڑا کر اور مغرب کو اسلام کے خلاف استعمال کر کے اپنا راستہ ہموار کرنا چاہتے ہیں۔

اسرائیل کے بارے میں عالمِ اسلام کا موقف

اس وقت ہمارا ماحول یہ ہے قرآن کریم کی وہ آیت ہمارے سامنے ہے ''لتجدن اشد الناس عداوۃ للذین امنوا الیھود والذین اشرکوا'' (المائدہ ۸۲)۔ لیکن عالم اسلام اسرائیل کے حوالے سے دو کیمپوں میں تقسیم ہے:

۱. ایک کیمپ جس میں پاکستان، سعودی عرب، ایران اور کچھ اور ممالک بھی ہیں، یہ سرے سے اسرائیل کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ہمارے پاسپورٹ میں لکھا ہوتا ہے کہ یہ پاسپورٹ اسرائیل کے لیے کارآمد نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اسرائیل کو ایک

ریاست تسلیم نہیں کرتے، اس کو ناجائز ریاست سمجھتے ہیں، اور ہمارا موقف یہ ہے کہ فلسطین پورے کا پورا فلسطینیوں کا ہے۔ صدام حسین مرحوم کو جب پھانسی دی گئی اس میں عراق کے مقامی مسائل بھی تھے لیکن مشرقِ وسطیٰ کے حوالے سے وہ اسرائیل کا سخت ترین مخالف تھا، یہودیوں کا دشمن اور فلسطینیوں کا سخت حامی تھا۔ وہ کلپ موجود ہے جب صدام کو پھانسی دی جا رہی تھی تو اس کی زبان پر آخری جملہ یہ تھا کہ اس نے اعلان کیا تھا فلسطین فلسطینیوں کا ہے، پھر ''اشھدان لا الہ الا اللہ'' آدھا کلمہ ہی پڑھا تھا کہ رسی کھینچ دی گئی تھی اور وہ شہید ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک موقف یہ ہے کہ فلسطین پورے کا پورا فلسطینیوں کا ہے، یہود نے غاصبانہ قبضہ کیا ہے، ناجائز قبضہ کیا ہے، اسرائیل کی ریاست ناجائز ہے، ہمارا موقف بھی یہی ہے۔

۲. لیکن ہمیں یہ نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ بہت سے مسلم ممالک اسرائیل کو تسلیم کرتے ہیں۔ اپنی صفوں کا یہ فرق ہمارے ذہن میں رہنا چاہیے۔ ترکی، مصر، اردن، قطر، شام نے اسرائیل کو تسلیم کیا ہے اور ان سے امریکہ نے تسلیم کرایا تھا۔ صدر جمی کارٹر نے کیمپ ڈیوڈ مذاکرات کروائے تھے اور اسرائیل تسلیم کرایا تھا، ان ممالک کے اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات بھی ہیں۔ لیکن جو ممالک اسرائیل کو تسلیم کرتے ہیں، وہ بیت المقدس کو اسرائیل کا حصہ تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ اسرائیل اس حد تک ایک جائز ریاست ہے جو اقوام متحدہ نے تقسیم کی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ نے تین حصوں میں تقسیم کیا تھا:

(۱) ایک حصہ یہودی اکثریتی آبادی پر مشتمل اسرائیل،

(۲) دوسرا فلسطین،

(۳) اور تیسرا (بیت المقدس) متنازعہ علاقے کے طور پر اردن کی تحویل میں۔

(۴) پھر ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل نے جو اردن کے حصے پر، شام کی گولان کی پہاڑیوں پر، اور بیت المقدس پر قبضہ کیا ہے، یہ ان ممالک کے ہاں بھی ناجائز قبضہ ہے، وہ اس علاقے کو اسرائیل کا حصہ تسلیم نہیں کرتے۔

یہ میں موقف کا فرق واضح کر رہا ہوں، کیونکہ بعض دوست پوچھتے ہیں او آئی سی (اسلامی تعاون

تنظیم) کوئی واضح قدم کیوں نہیں اٹھا رہی؟ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے جو ہمیں سمجھنی چاہیے، جب یہ اکٹھے بیٹھتے ہیں تو موقف کے فرق بلکہ تضاد کی وجہ سے کوئی اجتماعی حکمتِ عملی نہیں طے ہو پاتی۔

حضرات محترم! میں نے یہودیت کا کچھ تاریخی پس منظر، مسلم یہودی تعلقات کا ایک تناظر، اسرائیل کے قیام کا پس منظر، موجودہ معروضی صورتحال، اور مستقبل کے امکانات کے حوالے سے چند باتیں آپ کے سامنے عرض کی ہیں۔ اگلی نشست میں عیسائیوں کے حوالے سے گفتگو کا آغاز کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

عیسائیت

ابتدائی دور

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ حضرات علماء کرام! آج آپ سے بات کرنا چاہوں گا عیسائیت، مسیحیت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروکاری کا دعویٰ رکھنے، اور انجیل کی بات کرنے والوں کے بارے میں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ساڑھے پانچ، چھ صدیاں پہلے مبعوث ہوئے اور خاتم انبیائے بنی اسرائیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں انجیل عطا فرمائی، ان کو بغیر باپ کے پیدا کیا اور بغیر موت کے زندہ اٹھالیا۔ یہ ان کے اعزازات و امتیازات میں سے ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے فلسطین میں اپنی دعوت پیش کی، جنہوں نے مان لیا مسیحی کہلائے، جنہوں نے انکار کیا وہ یہودی رہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی تشریف آوری سے یہودیت و عیسائیت کی تقسیم ہوئی۔ یروشلم، بیت المقدس، فلسطین کے علاقے پر یہودیوں کا کنٹرول تھا، یہ یہود کا مرکز تھا۔ آہستہ آہستہ حضرت عیسیٰؑ کے پیروکار بڑھتے گئے، روم کے لوگ اور ان کا بادشاہ عیسائی ہو گئے تھے، روم عیسائیوں کا مرکز بن گیا اور تقریباً پون صدی یہ سلسلہ رہا۔ جبکہ یروشلم بدستور یہودیوں کا قبلہ اور مرکز تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کے ''رفع'' کے پون صدی بعد روم کے عیسائی بادشاہ طیطس نے حملہ کر کے یروشلم کو تاراج کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پانچ چھ صدیاں چلتی رہی۔

دورِ نبویؐ میں مسلم عیسائی معاملات

نبی اکرمؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تک عیسائیت حق مذہب تھا، اس دور میں جنہوں نے بھی عیسائیت قبول کی ہے وہ اہلِ حق تھے۔ حضورؐ کی تشریف آوری سے مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے عیسائیت کا دور ختم ہو گیا اور اسلام کا دور شروع ہوا۔ اس کے بعد عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کیسے رہے؟ جناب نبی کریمؐ کے دور میں یہ تعلقات کیسے تھے، حضورؐ کے بعد کن مراحل سے

گزرے، اس وقت کن مراحل میں ہیں، اور ہمارے تنازعات کیا ہیں، اس پر مفصل بات کریں گے، ان شاءاللہ تعالیٰ۔

عیسائی عالم ورقہ بن نوفل کی تصدیق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی وحی نازل ہوئی تو آپؐ کا واسطہ اہلیہ محترمہ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ذریعے ایک عیسائی عالم سے پڑا۔ بخاری کی روایت کے مطابق آپؐ نے غارِ حرا کا واقعہ ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ سے ذکر کیا اور فرمایا ”خشیت علیٰ نفسی“ مجھے اپنے بارے میں ڈر لگنے لگا ہے۔ حضورؐ کو تشویش تھی، آپؐ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو ام المومنینؓ نے تسلی دی کہ ”لن یخزیک اللہ ابدًا“۔ اللہ آپ کو تنہا نہیں چھوڑے گا۔ ”لانک تصل الرحم و تحمل الکل و تکسب المعدوم و تقری الضیف و تعین علی نوائب الحق“۔ یہ حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کی سماجی خدمات کا ذکر کیا۔ وہ عیسائی عالم حضرت خدیجہؓ کے چچازاد بھائی تھے۔ ورقہ بن نوفل جو عیسائیت کے عالم تھے، عبرانی زبان جانتے تھے اور انجیل کا عربی میں ترجمہ کر کے لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔

حضرت خدیجہؓ نے حضورؐ کو تسلی دی اور آپؐ کو لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں کہ وہ پرانے بزرگ اور عالم ہیں، اس کیفیت کا ذکر اُن سے کرتے ہیں، ان سے پوچھتے ہیں کہ یہ کیا معاملہ ہوا ہے، کیا خدشات ہیں؟ وہاں جا کر حضورؐ نے ان کو غار میں پیش آنے والا اپنا واقعہ سنایا، ورقہ بن نوفل چونکہ پرانی آسمانی کتابوں کے عالم تھے، وہ سمجھ گئے کہ یہ نبوت اور وحی ہے۔ کہا، یہ تو وہی ناموس ہے جو حضرت موسٰیؑ پر نازل ہوا تھا۔ اور پھر خدشے کا اظہار کیا کہ ایک وقت آئے کہ لوگ آپ کو پریشان کریں گے اور قوم کے لوگ آپ کو مکہ سے نکال دیں گے۔ اور اس حسرت کا اظہار کیا کہ اے کاش! میں اس وقت موجود ہوں، طاقتور ہوں، تو میں آپ کا ساتھ دوں گا، آپ کی مدد کروں گا۔ اس پر حضورؐ کو تعجب ہوا کہ یہ قوم تو مجھ سے بڑی محبت کرتی ہے، مجھے صادق و امین کہتی ہے، مجھ پر اعتماد کرتے ہیں، میرے پاس فیصلے لاتے ہیں۔ ”او مخرجی ھم؟“ کیا وہ مجھے مکہ سے نکال دیں گے؟ ورقہ بن نوفل نے کہا آپ جیسی بات جس نے بھی کی ہے اس کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ چونکہ اس وقت تک حضورؐ نے

اسلام کی دعوت کا آغاز نہیں کیا تھا تو ورقہ بن نوفل کے ان جذبات کے اظہار پر محققین ان کو اہلِ حق میں سے شمار کرتے ہیں۔

میں عرض کیا کرتا ہوں کہ جناب نبی کریمؐ اور وحی کو سب سے پہلے ایک عیسائی عالم سے واسطہ پیش آیا جس نے آپؐ کی تائید کی۔ جیسے قرآن کریم نے کہا ”الذين اتيناهم الكتاب يعرفونه كما يعرفون ابنائهم“ (البقرہ ۱٤٦)۔ اہلِ کتاب حضورؐ کو پہچانتے ہیں۔ یہ اہلِ کتاب کا حضورؐ کو پہچاننے کا سب سے پہلا اظہار تھا۔ ورقہ بن نوفل اس سے کچھ عرصہ بعد ہی فوت ہو گئے لیکن ان کی تصدیق، ان کے جذبات، ان کا ایمان تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔

ابوطالب اور حضرت عباسؓ کی پشت پناہی

اس کے بعد جناب نبی کریمؐ نے قریش کو اسلام کی دعوت دی جس پر مخاصمت، مخالفت، طعن و تشنیع، اذیت، تکلیفیں اور رکاوٹیں شروع ہوئیں۔ تیرہ سال یہ سلسلہ چلتا رہا۔ یہ بڑا صبر آزما مرحلہ تھا کہ اپنے ہی خاندان، برادری کے لوگ دشمن بن گئے تھے اور جان کے دشمن بن گئے تھے۔ رسول اللہؐ کی پشت پناہی کرنے والے آپ کے چچا ابوطالب اور عباسؓ تھے، باوجودیکہ ایمان نہیں لائے تھے مگر دونوں بھائیوں نے بڑی مضبوطی سے حضورؐ کی پشت پناہی کی۔ حضرت عباسؓ نے ایمان تو بہت بعد میں قبول کیا لیکن حضرت ابوذر غفاریؓ کے ایمان قبول کرنے کا واقعہ بخاری میں مذکور ہے کہ جب انہوں نے ایمان قبول کیا تو مکہ والے ان پر ٹوٹ پڑے، ان کو بچانے والے حضرت عباسؓ تھے جنہوں نے ایک دفعہ نہیں، تین دفعہ بچایا۔ جبکہ بیعتِ عقبہ اولیٰ اور بیعتِ عقبہ ثانیہ کے وقت بھی اگرچہ وہ ایمان نہیں لائے تھے لیکن انصارِ مدینہ کے ساتھ مذاکرات میں حضورؐ کے ساتھ تھے۔ اور تاریخی واقعہ ہے کہ جب انصار کے سرداروں نے حضورؐ سے کہا کہ آپ مدینہ تشریف لائیں، ہم آپ کی حفاظت کریں گے، آپ کا ساتھ دیں گے، تو وہاں حضرت عباسؓ بھی ان خفیہ ترین مذاکرات میں حضورؐ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں کہا تھا بات سنو! یہ میرا بھتیجا ہے، ہم اس کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ سن لو! میرے بھتیجے کو مکے سے لے جانے کا مطلب پورے عرب سے لڑائی مول لینا ہے، اگر پورے عرب سے لڑائی لڑ سکتے ہو تو لے جانے کی بات کرو، ورنہ ہم اس کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ ایمان

قبول کرنے سے پہلے وہ بطور چچا کے مذاکرات میں شریک تھے۔

حضورؐ کو ذاتی طور پر تمام تکلیفوں کے باوجود اپنے ان دو چچاؤں کی پشت پناہی حاصل تھی، لیکن جو حضورؐ کے باقی ساتھی تھے ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ بالخصوص حضرت بلالؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت خبابؓ وغیرہ کا کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

عیسائی بادشاہ اصحمہ نجاشیؒ کی پناہ گاہ

جب مظالم حد سے بڑھ گئے تو یہ فکر ہوئی کہ کہیں ہجرت کر کے چلے جانا چاہیے۔ چنانچہ مشورہ میں حبشہ طے ہوا کہ وہاں پناہ ملے گی۔ حبشہ کے بادشاہ اصحمہ عیسائی تھے، ان سے مسلمانوں کو توقع تھی کہ شاید حمایت کریں گے۔ چنانچہ ایک بڑی تعداد نے حضورؐ کی اجازت سے حبشہ کی ہجرت کی۔ وہاں اصحمہ نجاشیؒ، جو بعد میں مسلمان ہو گئے، انہوں نے ان کو پناہ بھی دی، حفاظت بھی کی، بلکہ قریش کا وفد مسلمانوں کو واپس لینے کے لیے شاہِ حبشہ کے پاس گیا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ تاریخی طور پر یہ ہمارا دوسرا واسطہ تھا اس وقت کے عیسائیوں کے ساتھ۔

تیسرا واسطہ عیسائیت کے ساتھ صلح حدیبیہ کے بعد پیش آیا۔ جناب نبی کریمؐ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور اردگرد کے ماحول میں کوئی عیسائی آبادی نہیں تھی، یہودیوں کی آبادیاں اور قبائل تھے۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ کے ساتھ معاملات پیش آتے رہے۔ لیکن عیسائیوں کی کوئی بڑی آبادی قریب نہیں تھی، ان کے ساتھ کوئی معاملہ براہ راست پیش نہیں آیا۔

عیسائی بادشاہوں کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط

البتہ صلح حدیبیہ کے بعد جب آپؐ نے ماحول کو سازگار دیکھ کر اردگرد کے بادشاہوں کو اسلام کی دعوت کے خطوط لکھے اور وفود بھیجے، کسریٰ، قیصر اور مقوقس وغیرہ کو خطوط لکھے۔

- فارس کے بادشاہ کسریٰ نے رسول اللہ کے نامہ مبارک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، فرعونیت کا اظہار کیا اور بحرین کے گورنر کو حکم دیا کہ اس شخص کو گرفتار کر کے میرے سامنے پیش کرو۔
- لیکن قیصر نے پورے پروٹوکول اور احترام کے ساتھ آپؐ کا نامہ گرامی پڑھا، اس کی مکمل

تفصیل بخاری میں حدیثِ ابی سفیانؓ میں ہے۔ ایمان اور دعوت کے حوالے سے میں اسے بنیادی احادیث میں شمار کیا کرتا ہوں۔ اس کے چند جملے عرض کرتا ہوں۔ قیصر نے قریش کے افراد کو بلایا کہ مدعیٔ نبوت کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔ ابوسفیان اپنے ساتھیوں سمیت اس کے دربار میں گئے۔ قیصر نے حضورؐ کے خاندان، آپؐ کی دعوت، آپؐ کے معاشرتی طرزِ عمل اور آپؐ کے ساتھیوں کے بارے میں تفصیل سے انٹرویو کیا۔ آخر میں اس نے دو تین باتیں کہیں وہ توجہ طلب ہیں۔ اس نے کہا کہ جو باتیں آپ نے بتائی ہیں اگر یہ سچ ہیں ''انہ لنبی'' تو بے شک وہ نبی ہے۔ اور اس نے کہا میں بھی اس نبی کی آمد کا منتظر تھا، میں نے خواب بھی دیکھے تھے اور اہلِ علم نے ان کی تعبیر یہی بتائی تھی کہ نبی آخر الزمان آنے والے ہیں، مجھے لگتا ہے کہ یہ وہی ہے۔ اب دیکھیے نبی بھی کہہ رہا ہے، تصدیق بھی کر رہا ہے، اپنے انتظار کی بات بھی کر رہا ہے، لیکن کانٹا یہاں سے بدلا کہ وہ کہنے لگا مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ تم بدوؤں میں آجائے گا۔

- مقوقسِ مصر کے پاس نامہ مبارک پہنچا تو اس نے بھی پروٹوکول دیا تھا، اگرچہ اسلام قبول نہیں کیا، اور ہدیے میں دو باندیاں بھیجی تھیں۔ ان میں سے ہی حضرت ماریہ قبطیہؓ سے آپؐ کے بیٹے حضرت ابراہیمؓ ہوئے تھے۔ اور دوسری باندی سیرینؓ، امام التابعین محمد بن سیرین کی والدہ تھیں۔ ماریہؓ اور سیرینؓ دونوں بہنیں مقوقسِ مصر کا ہدیہ تھیں۔ آج بھی مصر میں قبطی عیسائی موجود ہیں جو کہ باقی دنیا سے مختلف ہیں، اب بھی ان کے پادری پرانی وضع قطع کے ساتھ رہتے ہیں۔

قرآن کریم نے اہلِ کتاب کی اسی کیفیت کو یوں بیان فرمایا ''حسدًا من عند انفسهم من بعد ما تبين لهم الحق'' (البقرہ ۱۰۹) کہ اہلِ کتاب نے رسول اللہ اور قرآن کا انکار اس وجہ سے نہیں کیا کہ ان کو پہچاننے میں مغالطہ لگا ہے، پہچانتے تو ایسے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، لیکن حسد کی وجہ سے انکار کیا۔ حسد اس بات کا کہ یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو توقع تھی کہ نبی آخر الزمان ہم میں سے آئیں گے، ان کے ذریعے ہمارا دنیا پر غلبہ ہو گا۔ چنانچہ یہود کی نفسیات بیان کرتے ہوئے قرآن کریم نے کہا ''وكانوا من قبل يستفتحون على الذين كفروا'' (البقرہ ۸۹) یہودی آنحضرتؐ کا

نام لے کر اپنے دشمنوں پر رعب جتایا کرتے اور فتح کی دعا کیا کرتے تھے، ایسے ہی جیسے آج کل ہم مسلمان سارے معاملات امام مہدی کے حوالے کر کے کہہ دیتے ہیں وہ آنے والے ہیں، دیکھ لیں گے، تم سب سے نمٹ لیں گے، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، وہی جو کریں گے آکر کریں گے، ہم نے کچھ نہیں کرنا۔

درمیان میں ایک غیر متعلقہ بحث عرض کرتا ہوں جو آج کل ہمارے بعض اہلِ فکر و دانش کے ہاں چل رہی ہے کہ حکومت اور خلافت حکم ہے یا وعدہ ہے؟ ان کا کہنا ہے کی خلافت کا اللہ نے وعدہ کیا ہے، حکم تو نہیں دیا کہ خلافت قائم کرنی ہے۔ اور دلیل یہ آیت ہے ''وعد الله الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنهم فی الارض کما استخلف الذین من قبلهم'' (النور ۵۵)۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے بطور انعام کے وعدہ کر رکھا ہے کہ اگر تم دین پر چلتے رہے تو میں تمہیں زمین کی خلافت و حکومت دوں گا۔ حکم تو نہیں دیا۔ ایک دوست نے مجھ سے پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ کیا ہوا ہے کہ تم نے کچھ نہیں کرنا میں تمہیں جنت دے دوں گا۔ جب اللہ کا جنت کا وعدہ ہے تو کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ اسی قسم کی بات ہے کہ خلافت کا تو اللہ نے وعدہ کیا ہوا ہے۔

جس طرح آج ہمارا مزاج بن گیا ہے کہ ساری باتیں امام مہدیؒ اور حضرت عیسیٰؑ کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں، اسی طرح یہود کا مزاج تھا کہ نبی آخر الزمان آنے والے ہیں، ان کے آنے سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں بتا یہ رہا ہوں کہ یہود بھی اور عیسائی بھی حضورؐ کو پہچانتے تھے، حق ان پر واضح ہو چکا تھا، انہوں نے انکار جو کیا تو حسد کی وجہ سے۔ اور حسد اس بات کا تھا کہ نبیؐ ان کی توقعات کے برعکس بنی اسماعیل میں مبعوث ہو گئے تھے جبکہ ان کو توقع تھی کہ بنی اسرائیل میں سے ہوں گے۔ اسی کو قیصر نے یہ کہہ کر بیان کیا کہ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ تم بدوؤں میں آجائے گا۔ یہ ہمارا تیسرا واسطہ تھا عیسائیوں کے ساتھ۔

بنو طے کا عیسائی قبیلہ

آنحضرتؐ کی حیاتِ مبارکہ میں مسلمانوں کی عیسائیوں کے کسی طبقہ کے ساتھ لڑائی ہوئی ہے تو وہ

ہوئی ہے بنوطے سے۔ یہ عرب قبیلہ تھا، حاتم طائی کے زمانے میں عیسائی ہو گیا تھا، ان سے جو جنگ ہوئی اس میں بنوطے کو شکست ہوئی۔ عدی بن حاتم جنگ کے بعد روپوش ہو گئے تھے اور ان کی بہن سفانہ قیدی بن گئی تھیں۔ سفانہ جب آنحضرتؐ کے سامنے آئیں تو آپؐ نے ان کو چادر پیش کی، سر ننگا تھا، چادر مرحمت فرمائی۔ کسی نے کہا حضور! یہ کافر کی بیٹی ہے۔ فرمایا، بیٹی تو بیٹی ہوتی ہے چاہے کافر کی ہو۔ سفانہ نے آپؐ کا رویہ دیکھ کر عدی کو پیغام بھیجا کہ کہاں بھاگے پھرتے ہو یہاں تو رحمت ہی رحمت ہے، نرمی ہی نرمی ہے، معافی ہی معافی ہے۔ تو سفانہ کے کہنے پر عدیؓ واپس آئے اور اسلام قبول کر لیا، بلکہ یہ پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا تھا۔

نجران کے عیسائیوں سے واسطہ

اس کے بعد عیسائیت کے ساتھ معاملات کا وہ مذاکرہ و مکالمہ ہے جو مدینہ میں ہوا، جس کا قرآن کریم نے بھی ذکر کیا ہے۔ اس زمانے میں نجران میں عیسائی اکثریت کی آبادی تھی، یہ تقریبًا مسیحی ریاست تھی۔ نجران سعودیہ اور یمن کی سرحد پر ہے۔ اس وقت یہ سعودیہ کا صوبہ ہے، جبکہ یمن کا نجران پر دعویٰ ہے۔ حوثیوں اور سعودیوں کی جنگ میں نجران کا مسئلہ بھی ہے۔ جناب نبی کریمؐ نے نجران کے عیسائیوں کو بھی اسلام کی دعوت کا پیغام بھیجا۔

دلچسپ واقعہ ہے، امام ترمذی نے ذکر کیا ہے کہ نجران کے عیسائیوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے آپؐ نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو بھیجا۔ وہ کہتے ہیں میں نے جا کر ان کو قرآن سنایا، وہ اہلِ علم تھے، عیسائی علماء نے اعتراض کر دیا کہ ہمیں کیا قرآن سناتے ہو، قرآن کو تو تاریخ کا پتہ نہیں ہے، تمہارا قرآن کہتا ہے کہ جب حضرت مریمؑ گود میں عیسیٰؑ کو اٹھا کر قوم میں آئیں تو قوم نے کہا مریم! بچہ کہاں سے لے آئی ہو؟ "یا اخت ھارون" تیرا باپ بھی برا آدمی نہیں تھا، تیری ماں بھی بدکار نہیں ہے، یہ تو کنواری لڑکی بچہ کہاں سے لے آئی؟ انہوں نے کہا اسی سے پوچھو کہاں سے آیا ہے۔ اور پھر اس بچے نے بتایا بلکہ پورا خطبہ ارشاد فرمایا۔ نجران کے عیسائی علماء نے اعتراض کیا کہ قرآن میں مریم کو "یا اخت ھارون" کہا گیا ہے جبکہ ہارونؑ تو موسیٰؑ کے بھائی تھے، اور مریم ماں ہیں عیسیٰؑ کی، درمیان میں صدیاں حائل ہیں، تو یہ بہن بھائی کس طرح بن گئے؟ مغیرہ بن شعبہؓ ان کے اس اعتراض کا جواب

نہیں دے سکے۔

جواب ذہن میں نہ آنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کا جواب ہے ہی نہیں، بعض اوقات جواب ہوتا ہے لیکن بروقت ذہن میں نہیں آتا۔ واپس مدینہ منورہ آکر رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ وہاں کے عیسائی علماء نے تو یہ اعتراض کر دیا، میں ان کو کوئی جواب نہیں دے سکا۔ حضورؐ نے فرمایا: خدا کے بندے! سادہ سی بات تھی تمہارے ذہن میں نہیں آئی۔ تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ بنی اسرائیل میں یہ رواج تھا کہ اپنے بچوں کے نام پیغمبروں کے نام پر رکھا کرتے تھے، یہ ہارون کوئی اور تھے، یہ حضرت موسٰیؑ کے بھائی نہیں ہیں۔ اور انبیاء کے ناموں پر نام رکھنے کا رواج تو آج ہمارے ہاں بھی ہے۔ ممکن ہے اس مجلس میں بھی کوئی ہارون نام کا شخص بیٹھا ہو، کوئی موسٰی، کوئی عیسٰی بیٹھا ہو۔

پھر نجران کے عیسائی علماء کا وفد مدینہ منورہ آیا، جناب نبی کریمؐ کے ساتھ مجادلہ، مناظرہ، مکالمہ ہوا جو کئی دن تک جاری رہا، اس کی تفصیلات زیادہ تو نہیں ملتیں لیکن تثلیث اور توحید اس کا بنیادی موضوع تھا۔ مگر گفتگو کسی نتیجے پر نہیں پہنچی، اس پر جناب نبی کریمؐ نے مباہلہ کی دعوت دے دی۔ ’’تعالوا ندع ابنائنا وابنائكم ونسائنا ونسائكم وانفسنا وانفسكم ثم نبتهل فنجعل لعنة الله على الكاذبين‘‘ (آل عمران ٦١)۔ روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے مباہلہ کی دعوت قبول نہیں کی، کیونکہ ان کو علم تھا کہ آپؐ سچے نبی ہیں، ان کے مقابلے میں آکر خوامخواہ مرنا ہے، اس لیے مباہلہ کے لیے نہیں آئے۔ پھر اس کے بعد معاہدہ ہوا جو ’’معاہدہ نجران‘‘ کے نام سے مشہور اور کتب سیرت میں موجود ہے۔

قرآن کریم نے اس کا ذکر کیا ہے ’’قل یا اهل الكتاب تعالوا الى كلمة سواء بيننا وبينكم ان لا نعبد الا الله ولا نشرك به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضًا اربابًا من دون الله‘‘ (آل عمران ٦٤)۔ اس حوالے سے میں ایک اور بات کہا کرتا ہوں کہ یہ جو نجران کے عیسائی علماء سے حضورؐ کا مناظرہ یا مکالمہ ہوا، پھر مباہلہ کی بات آئی جس کی نوبت نہیں آئی، اور پھر معاہدہ ہوا، یہ تین مرحلے تھے۔ اس سے معلوم ہوا مذاہب کے درمیان مکالمہ کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

بین المذاہب مکالمہ کی بنیاد

قرآن کریم نے اہلِ کتاب کے ساتھ مکالمے کی ہمیں بنیاد فراہم کی ہے ”قل یا اھل الکتاب تعالوا الٰی کلمة سواء بیننا وبینکم ان لا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضًا اربابًا من دون اللہ“ (آل عمران ٦٤)۔ اہلِ کتاب سے جب بات کریں گے اس بنیاد پر کہ دو باتیں تو ہم میں قدرِ مشترک ہیں، ان پر بات نہیں ہوگی ”سواء بیننا وبینکم“ ان پر تو تم کو آنا ہی پڑے گا۔

پہلی بات ”ان لا نعبد الا اللہ و لا نشرک بہ شیئا“۔ اللہ کی عبادت اور شرک کی نفی تورات اور قرآن کا مشترک موضوع ہے۔ علماء کرام کبھی کبھی بائبل بھی دیکھ لیا کریں، توحید جس لہجے میں قرآن بیان کرتا ہے، آج کی تحریف شدہ بائبل بھی تمام تر تحریفات کے باوجود اسی لہجے میں توحید بیان کرتی ہے۔ تورات بھی، انجیل بھی، زبور بھی اسی لہجے میں توحید کی بات کرتی ہیں۔ اور یہ تو طے شدہ بات ہے کہ انبیاء کرامؑ کی بنیادی دعوت یہی تھی ”یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ“ (الاعراف ٦٥)۔ حضرت نوحؑ سے یہ دعوت شروع ہوئی اور جناب نبی کریمؐ تک یہ دعوت قدرِ مشترک کے طور پر چلتی رہی۔ اور قدرِ مشترک پر مباحثے نہیں ہوا کرتے۔ توحید تمام آسمانی مذاہب میں قدرِ مشترک ہے۔ غیر آسمانی اور خود ساختہ مذاہب سے ہم توحید کے موضوع پر بات کریں گے، مناظرہ کریں گے، لیکن آسمانی کتاب والوں سے توحید پر بات نہیں ہوگی۔

جبکہ دوسری قدرِ مشترک یہ فرمائی ”ولا یتخذ بعضنا بعضًا اربابًا من دون اللہ“ کہ آپس میں ایک دوسرے کو خدا نہیں بنائیں گے۔ اس کا آسان ترجمہ یہ کرتا ہوں کہ انسان پر انسان کی حاکمیت اور خدائی تسلیم نہیں ہوگی۔ حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اور یہ بات میں اپنے طرف سے نہیں کہہ رہا ”اربابًا من دون اللہ“ سے کیا مراد ہے؟ بخاری شریف کی روایت ہے حضرت عدی بن حاتمؓ کہتے ہیں کہ میں مسلمان ہوا، قرآن کریم پڑھا۔ قرآن کریم میں مجھے ایک مقام پر الجھن ہوئی کہ ”اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابًا من دون اللہ و المسیح ابن مریم“ (التوبہ ٣١) ان عیسائیوں نے اپنے احبار اور رہبان (علماء و مشائخ) اور عیسیٰؑ کو اپنا رب بنا لیا تھا۔

حضرت عدیؓ سابقہ عیسائی تھے، ان کو اشکال یہ ہوا کہ ہم تو احبار اور رہبان کو خدائی کا درجہ نہیں دیتے تھے، قرآن نے یہ ہمارے ذمے کیوں لگا دیا؟ کہتے ہیں میں نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ قرآن نے ہمارے بارے میں یہ کہا ہے جبکہ یا رسول اللہ! ہم تو اپنے احبار و رہبان کو خدا کا درجہ نہیں دیتے تھے۔ حضورؐ نے ان سے پوچھا، کیا تمہارے ہاں احبار و رہبان کو حلال و حرام میں ردوبدل کی اتھارٹی حاصل تھی؟ حلال کو حرام کرنے اور حرام کو حلال کرنے کی اتھارٹی حاصل تھی؟ اور یہ تو آج بھی پوپ کو حاصل ہے۔ انہوں نے کہا، جی حاصل تھی۔ فرمایا بس یہی مطلب ہے ''اربابًا من دون اللہ'' بنا لینے کا۔ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے اختیارات خدائی اختیارات ہیں۔ بات سمجھانے کے لیے کہتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ حلال و حرام میں اور جائز و ناجائز کے اختیارات میں کسی کو شریک کرتے تو کس کو کرتے؟ جناب نبی کریمؐ سے زیادہ کسی کا استحقاق ہو سکتا تھا؟ نہیں، جبکہ حضورؐ نے اپنی ذات کے لیے شہد کے حرام ہونے کی بات کی تھی تو قرآن نے کس لہجے میں بات کی۔ فرمایا ''یا ایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک تبتغی مرضات ازواجک واللہ غفور رحیم ο قد فرض اللہ لکم تحلة ایمانکم'' (التحریم ۱، ۲)۔

میں بات یہ کر رہا تھا کہ نجران کے عیسائیوں نے بالآخر معاہدہ کر لیا کہ بطور ذمی کے رہیں گے اور نجران اسلامی ریاست میں شامل ہو گیا تھا۔ لیکن قرآن کریم نے ہمیں قیامت تک کے لیے اصول بتا دیا کہ اہلِ کتاب سے بات تورات اور قرآن کے مشترکات پر نہیں ہوگی، وہ تو ماننا ہی پڑیں گے، مکالمہ بین المذاہب میں بات اس سے اگلے درجے میں ہوگی۔

بین المذاہب مکالمہ کے فریقین اور ایجنڈا

آج بھی مکالمہ بین المذاہب ہر سطح پر چل رہا ہے۔ گفتگو، مذاکرے، سیمینار، کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ قرآن کریم نے اہلِ کتاب کے ساتھ مکالمے کا ایجنڈا قیامت تک کے لیے طے کر دیا ہے، لیکن اس سے پہلے آپ کو ایک واقعہ سنانا چاہوں گا۔

عیسائی دنیا کے ایک بڑے پادری ہیں بشپ آف کنٹربری ڈاکٹر روون ولیمز، جو کہ برطانیہ کے سب سے بڑے پادری ہیں، پروٹسٹنٹ فرقے کے عالمی سربراہ ہیں۔ جس طرح کیتھولک کے سربراہ پاپائے

روم ہیں جو کہ فرانسس ہیں۔ کنٹربری ان کا سب سے بڑا چرچ ہے، اس کے سب سے بڑے بشپ ڈاکٹر رووِن ولیمز ہیں۔ بات سمجھانے کے لیے عرض کرتا ہوں، ایسے سمجھیں کہ ان کی عیسائی دنیا میں ویسی ہی حیثیت ہے جیسے ہمارے ہاں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث کی ہے۔

شوکت عزیز صاحب اور پرویز مشرف صاحب کا زمانہ تھا۔ ڈاکٹر رووِن ولیمز پاکستان تشریف لائے کہ میں علماء سے مکالمہ کرنا چاہتا ہوں۔ صاحبِ علم و دانش آدمی ہیں، شوکت عزیز صاحب اس زمانے میں پرائم منسٹر تھے، ان کے ساتھ ان کی گفتگو ہوئی۔ بہت سے حضرات کو بلایا گیا، مجھ سے پوچھا گیا کیا آپ اس گفتگو میں شریک ہوں گے، اگر آپ شریک ہوں تو ہم آپ کو بلائیں۔ میں نے پوچھا کون کون ہیں؟ بتایا گیا کہ ادھر سے ڈاکٹر رووِن ولیمز ہیں اور ادھر سے شوکت عزیز صاحب ہیں۔ میں نے کہا کوئی عقل کی بات کرو، وہ عیسائی مذہبی فرقے کے سربراہ ہیں، اپنے مذہب کی عالمی سطح پر نمائندگی کرتے ہیں، شوکت عزیز صاحب کس کی نمائندگی کرتے ہیں؟ دیوبندیوں کی؟ بریلویوں کی؟ اہلحدیثوں کی؟ شیعوں کی؟ میں نے کہا اگر دو شرطیں منظور ہوں تو میں گفتگو اور مکالمے کے لیے حاضر ہوں گا:

پہلی شرط یہ کہ مکالمہ اصل فریقوں میں ہونا چاہیے۔ شوکت عزیز کی کیا پوزیشن ہے، جبکہ دوسری طرف عیسائی دنیا کے مسلّمہ عالم ہیں۔ مجھ سے پوچھا گیا، اچھا پھر کیا کریں؟ میں نے کہا شیخ ازہر کو بلا لیں، یا امام کعبہ کو بلا لیں، یا انڈیا سے ندوہ یا دیوبند کے سربراہ کو بلا لو۔ کسی ایسی شخصیت کو بلاؤ جو کسی فرقے کی نمائندگی کرتی ہو۔ وہ کہنے لگے، پاکستان سے کس کو بلائیں۔ میں نے کہا حاجی عبدالوہاب صاحب کو بلا لو کہ وہ ایک عالمی تحریک کی نمائندگی کرتے ہیں۔

دوسری شرط میں نے یہ کہی کہ ایجنڈا بیلنس کریں۔ گفتگو کا ایجنڈا تھا کہ ''مذہب اس وقت دہشت گردی کا سبب بن رہا ہے اس کو کیسے کنٹرول کیا جائے؟ مذہب کے نام پر دہشت گردی کو کیسے روکا جائے؟'' میں نے کہا ہمارے ہاں مناظرے کا معروف اسلوب ہے کہ دو فریق آپس میں مناظرہ کرتے ہیں، ایک فریق چیلنج کرتا ہے دوسرا قبول کرتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ دونوں طرف سے ایک ایک موضوع ہوتا ہے۔ ایک موضوع ایک فریق پیش کرتا ہے اور دوسرا موضوع دوسرا فریق پیش کرتا ہے کہ میں آپ کے موضوع پر بات کروں گا، لیکن آپ کو میرے موضوع پر بات کرنی ہوگی۔ اور دونوں پر گفتگو ہوتی ہے۔ یہ مناظرے کی روایات میں سے ہے۔ دنیا میں کہیں مذہب دہشت گردی کا ذریعہ بن رہا

ہے یا نہیں، اگر بن رہا ہے تو اسے کنٹرول کیسے کیا جائے۔ میں نے کہا کہ کسی بھی دائرے میں کسی سطح پر گفتگو کرنا چاہیں، ہم پوری تسلی اور اطمینان کے ساتھ بات کریں گے، لیکن ایک موضوع ہمارا بھی ساتھ شامل کر لیں کہ مذہب سے انحراف کر کے انسانی سوسائٹی نے فائدہ اٹھایا ہے یا نقصان اٹھایا ہے؟ انقلابِ فرانس کے بعد سوسائٹی نے جو مذہب کو معاشرتی زندگی سے نکال دیا تھا، اس کا مجموعی طور پر نسلِ انسانی کو فائدہ ہوا ہے یا نقصان ہوا ہے؟ اس پر بھی ہم بات کریں گے۔ اس طرح پہلے ایجنڈا بیلنس کریں، پھر مکالمہ ہو گا۔

میں نے کہا مجھے زیادہ مکالموں میں جانے کا شوق نہیں ہے لیکن اگر کرنا ہے تو میری یہ دو شرطیں ہیں کہ (۱) مکالمہ اصل فریقوں میں ہونا چاہیے اور (۲) ایجنڈا بیلنس ہونا چاہیے۔

گوجرانوالہ کے ایک بڑے عیسائی پادری تھے فادر روفن جولیس۔ بپٹسٹ فرقے کے پاکستان کے بڑے بشپ تھے، ایم این اے رہے ہیں اور وفاقی منسٹر رہے ہیں، ان کی اہلیہ محترمہ ایم پی اے رہی ہیں اور شہباز شریف کی پچھلی کابینہ میں صوبائی منسٹر رہی ہیں، فادر روفن جولس مرکزی وفاقی وزیر رہے ہیں۔ ایک دفعہ ان کا مجھے اور دوسرے علماء کو پیغام آیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب گستاخانہ خاکوں اور توہینِ رسالتؐ کا مسئلہ زور پر تھا۔ پیغام تھا کہ میں آپ سے ہیومن رائٹس کے بارے میں مکالمہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے لیکن ہم آپ سے بات ہیومن رائٹس پر نہیں کریں گے کہ آپ ہیومن رائٹس کے نمائندے نہیں ہیں۔ آپ بائبل کے نمائندے ہیں۔ ہیومن رائٹس پر اگر بات کرنی ہے تو عاصمہ جہانگیر سے یا ایس اے رحمان سے کریں گے، جو اُن کے نمائندے ہیں۔ آپ ہیومن رائٹس کے نمائندے کب سے بن گئے ہیں؟ آپ تو بائبل کے نمائندے ہیں، ہم آپ سے کسی مذہبی گفتگو کے لیے تیار ہیں، بائبل اور قرآن درمیان میں رکھیں گے اور آج کے مسائل پر گفتگو کریں گے۔ آپ کا ٹائٹل ”فادر“ کا ہے ہیومن رائٹس پر بات آپ سے کیوں کریں؟

آج میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عیسائیت کے ساتھ پیش آنے والے معاملات کا ذکر کیا ہے اور عیسائی مسلم تعلقات پر بات کی ہے اور آپؐ کی حیاتِ مبارکہ میں مسلم عیسائی تعلقات کی جو نوعیت تھی اس کا ہلکا سا خاکہ پیش کیا ہے:

۱۔ ہمارے عیسائیوں سے تعلقات کا آغاز وحی کے فوراً بعد ورقہ بن نوفل سے ہوا۔

۲. اس کے بعد حبشہ کے شاہ نجاشی اصحمہؓ کے ساتھ ہمارا دوسرا معاملہ ہوا، انہوں نے مسلمانوں کو پناہ دی تھی اور اسلام قبول کر لیا تھا۔

۳. قیصرِ روم کو خط لکھا گیا اس نے ریمارکس دیے۔ مقوقسِ مصر عیسائی بادشاہ تھا، اسے خط لکھا گیا، اس نے جو پروٹوکول دیا وہ میں نے عرض کیا تھا کہ اس نے اپنی دو باندیاں حضورؐ کی خدمت میں پیش کیں۔

۴. بنو طے کی لڑائی اور حضرت عدیؓ بن حاتم کے ساتھ ساتھ ان کے قبیلہ کا قبولِ اسلام۔

۵. پھر نجران کا وفد آیا تھا، اس کے ساتھ مناظرہ اور مباہلہ کی بات اور پھر معاہدہ ہوا۔

خلافتِ راشدہ کے دور میں مسلم عیسائی کشمکش

اس کے بعد عیسائیوں کے ساتھ باقاعدہ کشمکش کب شروع ہوئی؟ جناب نبی کریمؐ نے حدیبیہ کے بعد مختلف علاقوں کے بادشاہوں کی طرف اور مختلف قبائل کے سرداروں کی طرف خطوط لکھے۔ شام کے علاقے میں مختلف قبائل اور سرداریاں تھیں لیکن کنٹرول قیصرِ روم کا تھا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ یہ قبائل قیصرِ روم کی نوآبادیاں تھیں یا ان کے صوبے تھے۔ ان میں سے ایک سردار نے جناب نبی کریمؐ کے قاصد کو شہید کر دیا جو خط لے کر گیا تھا، غالباً ان کا نام شرجیلؓ تھا۔

موتہ کا معرکہ

رسول اللہ نے اس کا بدلہ لینے کے لیے زید بن حارثہؓ کی قیادت میں تین ہزار کی فوج بھیجی۔ اس فوج نے موتہ میں جا کر جنگ لڑی، ان کے بارے میں حضورؐ نے فرما دیا تھا کہ زیدؓ شہید ہوئے تو جعفرؓ امیر ہوں گے، جعفرؓ شہید ہو گئے تو عبداللہ بن رواحہؓ امیر ہوں گے۔ ان کی وہاں عیسائیوں سے جنگ ہوئی۔ یہ عیسائیوں کے ساتھ ہماری پہلی باقاعدہ جنگ ہے، اس میں ہمیں غلبہ نہیں ملا تھا۔ یہ تینوں امراء یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے تو اس افراتفری سے نکالنے کے لیے حضرت خالد بن ولیدؓ خود آگے بڑھے اور لشکر کی کمان سنبھالی۔ اور ان کی سب سے بڑی کامیابی جس پر انہیں ''سیف من

سیوف اللّٰہ'' کا خطاب ملا، وہ ان کا یہ کارنامہ تھا کہ تین ہزار کے لشکر کو بڑی مہارت کے ساتھ اس جمِ غفیر سے نکال کر بحفاظت مدینہ لے آئے تھے اور اپنے لشکر کو بچا لیا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ مدینہ والوں نے ان کا استقبال جوتوں سے کیا تھا کہ ''انتم الفرارون'' تم فرار ہو کر آئے ہو، میدان چھوڑ کر آئے ہو، بھاگ کر آئے ہو۔ تو نبی کریمؐ نے فرمایا کہ نہیں! تم کہو ہم فرارون نہیں کرارون ہیں، ہم دوبارہ حملے کی تیاری کرنے کے لیے آئے ہیں، ہم دوبارہ جائیں گے۔

چنانچہ اسی جنگ کے تسلسل میں جناب رسول اللہ نے اپنے وصال سے پہلے موتہ کی طرف لشکر روانہ کیا اور اس کا امیر عرب قبائل کی روایات کے مطابق حضرت زید بن حارثہؓ کے بیٹے اسامہ کو بنایا کیونکہ غزوہ موتہ میں وہ امیرِ جنگ تھے اور شہید ہوئے تھے۔ تو ان کے بیٹے اسامہ کو امیر بنایا جو نوعمر تھے، انیس بیس سال عمر ہوگی۔ اس پر اعتراض بھی ہوا تھا کہ ایک لڑکے کو امیر بنا دیا ہے، تو آپؐ نے فرمایا کہ تم نے اس کے باپ پر بھی اعتراض کیا تھا ''وانہ لخليق بالامارة'' حالانکہ وہ امارت کا اہل تھا۔ اب اس پر اعتراض کر رہے ہو، یہ بھی امارت کا اہل ہے۔ اس لشکر کو حضورؐ نے تیار کر کے روانہ کر دیا تھا۔ ابھی ایک آدھ دن ہی گزرا تھا کہ حضورؐ کا وصال ہو گیا، یہ لشکر قریب ہی تھا وہیں رک گیا۔ حضرت صدیق اکبرؓ خلیفہ بنے، ان سے پوچھا گیا اس لشکر کا کیا کرنا ہے؟ چونکہ عمومی افراتفری مچ گئی تھی، بہت سے قبائل باغی ہو گئے تھے اور مرتدین، منکرینِ ختمِ نبوت اور منکرینِ زکوٰۃ کا بڑا ہجوم ہو گیا تھا، تو بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ اس لشکر کو روک لیا جائے کہ انہوں نے شام جانا ہے، عرب کی حدود سے باہر جانا ہے، ملک کے حالات جب ٹھیک ہوں گے تو پھر ان کو بھیج دیجیے گا۔ تو حضرت صدیق اکبرؓ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ جس لشکر کو جناب نبی کریمؐ نے خود روانہ کیا، میں اس کو واپس نہیں بلا سکتا، یہ لشکر جائے گا، چنانچہ وہ لشکر گیا۔

تبوک کا معرکہ

موتہ کے بعد دوسرا معرکہ تبوک کا تھا۔ تبوک میں لڑائی نہیں ہوئی لیکن پھر بھی بہت بڑا معرکہ ہے، جو جیشِ عسرۃ کہلاتا ہے، جس کے تذکرے سے سورہ توبہ بھری پڑی ہے، جس طرح سورہ انفال میں غزوہ بدر کے واقعات کا تذکرہ ہے۔ اس پر میں عرض کیا کرتا ہوں کہ بدر ہماری پہلی جنگ تھی اور

تبوک حضورؐ کی زندگی کا آخری بڑا معرکہ تھا۔ قرآن کریم نے ایک سورہ میں پہلے غزوہ کی اور دوسری سورہ میں آخری غزوہ کی تفصیلات بیان کیں۔ اول و آخر دونوں کو بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے جہاد کے احکام بیان فرمائے۔

تبوک کا پس منظر یہ ہے کہ چونکہ قیصرِ روم کے علاقے میں جنگ ہوئی تھی، موتہ شام کے اندر ہے اور شام روم کا علاقہ تھا۔ تو قیصرِ روم نے اس تناظر میں فیصلہ کیا کہ میں موتہ کی جنگ کے جواب میں شام کی فوجوں کو اکٹھا کر کے مدینہ پر چڑھائی کروں گا۔ اطلاع یہ ملی کہ وہ خود شام آیا ہوا ہے، فوجیں اکٹھی کر رہا ہے اور مدینہ منورہ پر چڑھائی کا ارادہ رکھتا ہے۔ جناب نبی کریمؐ کو جب یہ اطلاع ملی تو حضورؐ نے بڑی حکمت و فراست کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ میں خود جاؤں گا اور یہ لڑائی مدینہ میں نہیں ہوگی بلکہ شام کی سرحد پر ہوگی۔ ایک کمانڈر کے لیے سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ میدانِ جنگ کون سا ہونا چاہیے۔ سمجھدار کمانڈر میدانِ جنگ اپنی مرضی کا منتخب کرتے ہیں جو کہ آدھی کامیابی ہوتی ہے۔ بدر میں بھی ایسے ہی ہوا تھا فرمایا ''و لو تواعدتم لاختلفتم فی المیعاد'' (الانفال ۴۲) تم آپس میں جگہ طے کرتے تو تمہارا آپس میں اتفاق نہیں ہوتا تھا کہ کہاں لڑنا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں ان کو اُدھر سے لایا، اِدھر سے تمہیں لایا اور بدر میں اکٹھا کر دیا۔ تبوک سعودی عرب کا شام کی طرف آخری شہر ہے، گویا شام اور سعودیہ کی جزیرۃ العرب کی سرحد ہے۔

تبوک کے لیے بڑی عجلت سے لشکر تیار کیا گیا۔ حالات یہ تھے فصلیں پکی ہوئی تھیں اور شدید گرمی کا موسم تھا۔ زمیندار جانتے ہیں کہ فصل پکی ہوئی ہو اور زمیندار کو کہیں جانے کو کہا جائے تو یہ اس کے لیے بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ طویل سفر تھا، ایک مہینہ جانے میں لگا تھا، ایک مہینہ واپسی پر لگا۔ حکم آ گیا ''انفروا خفافا وثقالًا وجاهدوا باموالكم وانفسكم في سبيل الله'' (التوبہ ۴۱) ہلکے ہو یا بوجھل ہو، نکلو۔ صحابہ کرامؓ کے ایثار و قربانی کا کمال یہ ہے کہ وہ نکل پڑے۔ منافقین پیچھے رہ گئے ''یعتذرون الیکم اذا رجعتم الیهم'' (التوبہ ۹۴) تین مسلمان بھی غلطی کا شکار ہوئے ''وعلی الثلٰثۃ الذین خلفوا'' (التوبہ ۱۱۸)۔ تبوک پہلی باقاعدہ محاذ آرائی تھی جو روم اور مسلمانوں کے درمیان ہوئی۔ بنو طے کے بعد موتہ اور تبوک سے ہماری عیسائیت کے ساتھ کشمکش کا آغاز ہوا۔ رسول

اللہؐ نے اسی موقع کے لیے فرمایا تھا ''نصرت بالرعب مسیرۃ شھر'' ایک مہینے کی مسافت تھی، رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی۔ یہ تبوک ہی کی بات ہے۔ آپؐ مدینہ سے چلے، قیصرِ روم کو جب پتہ چلا کہ محمد خود لشکر کی کمان کرتے ہوئے شام کی طرف بڑھ رہے ہیں، قیصر تھا تو وہی جس نے ابوسفیان کے سامنے ''انہ لنبی'' کہہ کر اقرار کیا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ آپؐ اللہ کے پیغمبر ہیں، تو اس کو حوصلہ نہیں ہوا، وہ شام میں ہی رہا۔ ایک روایت کے مطابق ایک لاکھ کا لشکر اس نے اکٹھا کیا تھا لیکن آپؐ کا سن کر ایک طرف دبک گیا۔ جناب نبی کریمؐ سرحد پر تبوک میں آ کر بیٹھ گئے تھے، آگے نہیں بڑھے تھے۔ ایک مہینہ وہاں قیصرِ روم کے انتظار میں بیٹھے رہے کہ ہمارے علاقے میں آئے گا تو ہم حملہ کریں گے، ادھر جا کر حملہ نہیں کریں گے، کیونکہ تبوک جزیرۃ العرب کا آخری شہر تھا اور آگے شام تھا۔

یہاں ایک ضمنی بات عرض کرتا ہوں۔ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا اسلامی ریاست کی سرحدیں ہوتی ہیں؟ میں عرض کرتا ہوں کہ ہوتی ہیں۔ اسی لیے حضورؐ تبوک جا کر رک گئے کہ یہاں جزیرۃ العرب کی سرحد تھی۔ جب ایک مہینہ انتظار کے باوجود قیصر مقابلے پر نہ آیا تو آپؐ واپس چلے آئے۔ اس طرح غزوہ تبوک میں تین مہینے لگے تھے، ایک مہینہ جاتے ہوئے، ایک مہینہ وہاں انتظار میں، اور ایک مہینہ واپسی پر۔ تبوک میں لڑائی ہوئی نہیں تھی لیکن لڑائی کا ماحول بن گیا تھا۔

نبی اکرمؐ کا وصال اور حضرت ابوبکرؓ کی استقامت

فارس اور روم دنیا کی دو بڑی طاقتیں تھیں۔ رومہ بڑی عیسائی سلطنت تھی، قسطنطنیہ (استنبول) اس کا دارالحکومت تھا۔ اس طرح دنیا کی سب سے بڑی عیسائی سلطنت کے ساتھ مسلمانوں کا جنگ کا ماحول تبوک کے موقع پر بن گیا تھا، خود جناب نبی کریمؐ کی حیاتِ مبارکہ میں اور حضورؐ کی قیادت میں۔ اس سے واپسی کے کچھ عرصہ ہی بعد آنحضرتؐ کا انتقال ہو گیا۔ جناب صدیق اکبرؓ نے خلافت سنبھالی تو حضرت ابوبکرؓ کی زیادہ توجہ داخلی انتشار پر قابو پانے کی رہی اور بحمد اللہ بڑی محنت، ثابت قدمی اور استقلال سے انہوں نے داخلی انتشار پر قابو پایا۔ حضرت ابوبکرؓ کو گھر سے ہی بغاوتوں کا سامنا تھا، مسیلمہ کذاب کی بغاوت، طلیحہ کی بغاوت، اسود عنسی کی بغاوت، مالک بن نویرہ کی بغاوت، مرتدین اور

منکرینِ زکوٰۃ وغیرہ سے نمٹنا تھا۔ اور کل اڑھائی سال ان کو ملے خلافت کے، اس طرح ان کا زمانہ داخلی خلفشار پر قابو پاتے ہوئے گزر گیا، یہ بہت بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبرؓ کی استقامت اور جرأت عالمِ اسباب میں مدینہ کی ریاست کو بچا گئی تھی۔ اگر وہ تھوڑے سے ڈھیلے پڑ جاتے تو عالمِ اسباب میں ریاست مدینہ کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ حالات اتنے خوفناک ہو گئے تھے کہ حضرت صدیق اکبرؓ سے حضرت عمرؓ بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ حضرت! ایک دو محاذ ابھی روک دیں، منکرینِ زکوٰۃ کے ساتھ لڑنے کی ابھی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اگر مدینہ منورہ پر حملہ ہو جائے تو کوئی بچانے والا نہیں ہے، ہمارے پاس نفری ہونی چاہیے، ساری فوجیں باہر چلی گئی ہیں، دارالحکومت کی حفاظت کے لیے کوئی نفری موجود نہیں ہے۔ کسی نے حضرت صدیق اکبرؓ کے جذبات کو ابھارنے کے لیے کہا حضرت! ازواجِ مطہرات یہاں بیٹھی ہیں اگر مدینہ پر حملہ ہوا تو کیا ہوگا؟ یہ بات حضرت ابوبکرؓ ہی کر سکتے ہیں، ہمیں تو نقل کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ امام سیوطیؒ نے ان کا یہ جملہ نقل کیا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کے دو جملے تاریخی جملے ہیں:

۱. ایک منکرینِ زکوٰۃ کے حوالے سے "اینقص الدین و انا حی؟" دین میں کمی ہوگی اور میں بھی زندہ ہوں گا، یہ نہیں ہو سکتا۔

۲. اور دوسرا جملہ انہوں نے یہ فرمایا تھا "لوجرت الکلاب بارجل ازواج النبی ﷺ"۔ اگر بھیڑیے ازواج نبی ﷺ کو پکڑ کر گھسیٹتے پھریں اور بچانے والا کوئی نہ ہو، یہ صورتحال مجھے قبول ہے، لیکن کوئی محاذ بند کر دوں، یہ بات میرے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ جواب دیا تھا اور حضرت عمرؓ کو ڈانٹا تھا "اجبار فی الجاهلية و خوار فی الاسلام" آپ جاہلیت میں تو اتنا بہادر تھے کہ حضورؐ کو شہید کرنے چلے تھے، اب اتنے کمزور پڑ گئے ہو؟

حضرت عمرؓ کا دورِ خلافت

حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو قیصرِ روم کے ساتھ کیفیت صلح کی رہی۔ روایات میں آتا ہے کہ قیصرِ روم کی ریاست بھی موجود تھی، مدینہ کی ریاست بھی موجود تھی، آپس کے تعلقات بھی

تھے۔ حضرت عمرؓ کے عدل و انصاف سے متعلق ایک روایت میں ذکر ہے کہ قیصرِ روم کی اہلیہ نے حضرت عمرؓ کی اہلیہ کو خوشبو تحفے میں بھیجی۔ مطلب یہ کہ آپس میں تحائف کا تبادلہ بھی ہوتا تھا، سفیروں کا تبادلہ بھی ہوتا تھا۔ مگر ساتھ ساتھ شام کے علاقے میں لڑائی بھی جاری تھی، شام میں بڑے بڑے معرکے ہوتے رہے اور آہستہ آہستہ شام کا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ شام کے فاتحین تین ہیں: (۱) ابوعبیدہ عامر بن الجراحؓ (۲) خالد بن ولیدؓ (۳) اور یزید بن ابی سفیانؓ۔

یہ یزیدؓ حضرت معاویہؓ کے بڑے بھائی ہیں، بڑے صحابہ میں سے ہیں، بڑے کمانڈر تھے، شام کے فاتحین میں ہیں۔ اسی میں بیت المقدس کا معرکہ ہوا۔ بہت بڑا معرکہ تھا۔ جب حضرت ابوعبیدہؓ بیت المقدس پہنچے، وہاں کا محاصرہ کیا، بیت المقدس پر عیسائی اہلِ علم کا کنٹرول تھا، انہوں نے کتابوں میں جو نشانیاں پڑھ رکھی تھیں انہیں دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے کہا ہم صلح کرتے ہیں اور بیت المقدس تمہارے حوالے کرتے ہیں، لیکن ہماری شرط یہ ہے کہ کہ تمہارا امیر خود آئے گا، ہم چارج تمہیں نہیں دیں گے، تمہارے امیر کو دیں گے۔ اس پر حضرت عمرؓ خود سفر کر کے تشریف لے گئے اور بیت المقدس کا کنٹرول حاصل کیا۔

ادھر دمشق میں بھی اسلامی فوجیں داخل ہوئیں اور دمشق فتح ہو گیا۔ اللہ کی قدرت کہ حضرت ابوعبیدہؓ اسی دوران انتقال فرما گئے، ورنہ وہ ابھی امیر تھے۔ اور باقی دو کمانڈروں میں سے حضرت عمرؓ نے شام اور دمشق کا گورنر یزید بن ابی سفیانؓ کو مقرر کیا۔ وہ شام کے پہلے مسلمان گورنر ہیں، یہ کچھ عرصہ گورنر رہے، پھر بیمار ہوئے اور ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی جگہ پھر ان کے بھائی حضرت معاویہؓ کو شام کا امیر بنایا گیا جو نصف صدی کے لگ بھگ شام کے امیر رہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں، پھر پانچ سال کا متنازعہ زمانہ بھی، اس کے بعد بیس سال کا عرصہ امارت کا۔

حضرت خالد بن ولیدؓ کا شکوہ اور خراجِ عقیدت

اس پر ایک دلچسپ واقعہ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں ذکر کیا ہے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ دمشق کی فتح کے بعد ریٹائرمنٹ لے کر حمص چلے گئے تھے، اس کے بعد معرکوں میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ان کی قبر حمص میں ہے، یہ شام کا علاقہ ہے۔ تاریخ ابن عساکر میں ہے کہ ایک دن حضرت خالدؓ نے اپنے

دوستوں میں بیٹھے ہوئے معاصرانہ شکوہ کے طور پر کہا کہ لڑ لڑ کر ہم مر گئے، ہم نے لڑائیاں لڑیں، شام فتح کیا، اور جب دمشق پر کنٹرول ہو گیا اور شام نے اپنا شہد اور گندم مدینہ بھجوانا شروع کر دیا ہے تو اب کسی اور کو (یزیدؓ کو) یہاں کا امیر بنا دیا ہے اور مجھے کہتے ہیں غزوۂ ہند کی تیاری کرو۔ حضرت عمرؓ نے کہیں اشارہ دیا ہو گا کہ اب آپ کو ہندوستان بھیجنا ہے۔ مجلس میں ہر طرح کے لوگ بیٹھے ہوتے ہیں، کسی نے کہا حضرت! آپ انکار کر دیں۔ ایک اور آدمی بولا انکار کریں گے تو فتنہ پیدا ہو گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ حکم دیں اور یہ انکار کر دیں۔ یہ سن کر حضرت خالدؓ سیدھے ہو کر بیٹھے اور فرمایا "اما فی عهد عمر، فلا" گھبراؤ نہیں عمرؓ کے ہوتے ہوئے کوئی فتنہ نہیں کھڑا ہو گا۔ یہ بڑا زبردست خراجِ عقیدت ہے حضرت عمرؓ کو۔

شام، مصر اور عراق کی فتوحات

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں شام کا علاقہ مکمل طور پر رومیوں سے، اور عراق کا سارا علاقہ ایرانیوں سے مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ ایران کی ریاستوں میں سے بحرین تو حضورؐ کے زمانہ ہی میں قابو آ گیا تھا۔ علاء بن حضرمیؓ کو حضورؐ نے گورنر مقرر کر دیا تھا۔ جس طرح بحرین بڑا گڑھ تھا فارس (ایران) کا، شام بڑا گڑھ تھا روم کا۔ بہرحال یہ معرکہ شام کا ہمارا عیسائیوں سے تھا۔

اس کے بعد مصر میں معرکہ آرائی ہوئی۔ مصر بھی عیسائی ریاست تھا۔ مقوقسِ مصر کو آپؐ نے اسلام کی دعوت کا خط لکھا، اس نے بڑے احترام اور پروٹوکول سے جواب دیا لیکن اسلام قبول نہیں کیا۔ مصر کا علاقہ فتح کیا ہے حضرت عمرو بن العاصؓ نے، آپؓ فاتحِ مصر ہیں اور مصر کے گورنر بھی رہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں یہ تین بڑے خطے قابو آئے مصر، شام اور عراق۔ عراق ایرانیوں سے اور شام و مصر عیسائیوں سے۔

دورِ خلافتِ راشدہ کے بعد

دورِ خلافت راشدہ کے بعد بھی یہ لڑائیاں چلتی رہیں۔ چھوٹے چھوٹے معرکے تو ہوتے رہے،

بیسیوں جنگیں ان معرکوں میں ہوئی ہیں۔ تیسرا بڑا معرکہ ہمارا عیسائیوں کے ساتھ اندلس کا ہے۔ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے ہمیں کامیابی دی۔ طارق بن زیادؒ لشکر لے کر جا رہے تھے۔ جب افریقہ سے یورپ میں داخل ہوئے، اندلس میں۔ مراکش افریقی شہر ہے اور اس کے درمیان میں سمندر کی سولہ سترہ میل کی پٹی ہے، دوسری طرف اندلس ہے۔ مراکش اور اندلس آمنے سامنے ہیں۔ طارق بن زیادؒ وہ سمندر کی پٹی عبور کر کے گئے تھے اور دوسری طرف جا کر ساری کشتیاں جلا دیں۔ یہ اندلس کا معرکہ عیسائیوں کے ساتھ ہوا جو بڑے معرکوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ کشمکش چلتی آ رہی تھی، اس دوران عیسائیوں نے اپنی شکست پر پھر کروٹ لی اور مسلمانوں کے ساتھ محاذ آرائی کا بازار گرم کیا۔

ایک دور ہے آنحضرتؐ کا۔ دوسرا دور عیسائیوں کے ساتھ کشمکش کا ہے جس میں شام، مصر اور وقفہ کے بعد اندلس کی جنگ ہے۔ اس کے بعد جو نیا محاذ صلیبی جنگوں کا بنا، اس کا سبب بیت المقدس تھا۔ میں نے بتایا تھا کہ بیت المقدس ہمارا تو ہے ہی، یہودی اور عیسائی بھی دعویدار ہیں بیت المقدس کے۔ مسلمانوں کے ہاتھ آنے پر عیسائیوں کو بہت تکلیف تھی اور ہونی چاہیے تھی، فطری بات ہے جیسے بیت المقدس یہود کے ہاتھ جانے پر ہمیں تکلیف ہے۔ کوئی بھی مسلمان اس صورتحال پر خوش نہیں ہے، بڑے اضطراب کی کیفیت ہے۔

عیسائیوں نے بیت المقدس کو ٹارگٹ بنا کر پلاننگ کی تھی کہ ہم نے اپنا شہر یروشلم واپس لینا ہے۔ یہ پلاننگ پاپائے روم پوپ اربن ثانی نے کی تھی، اس زمانے میں عیسائی دنیا پر پادریوں کی حکومت ہوتی تھی۔ انقلابِ فرانس کے بعد حکومتوں پر پادریوں کا کنٹرول ختم ہوا، اس سے پہلے پاپائے روم کو حکومتوں کے سب سے بڑے سرپرست کی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ یہ صلیبی جنگیں دو سو سال جاری رہیں۔ مذہب اور صلیب کے نام پر اور یروشلم کی واپسی کے نام پر رہی ہیں۔ اس دوران نوے سال بیت المقدس عیسائیوں کے پاس رہا، پھر صلاح الدین ایوبیؒ نے ان سے واپس لیا۔ یہ صلیبی جنگیں کیا تھیں، اس میں عیسائیوں کے کون کون سے لوگ شریک تھے اور ہمارا کیا کردار تھا، اس پر ان شاء اللہ العزیز اگلی نشست میں تفصیل سے گفتگو ہوگی۔

اندلس کی خلافتِ بنوامیہ

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ حضرات علماء کرام! ہمارا یہ موضوع چل رہا ہے کہ اس وقت جو مختلف مذاہب انسانی سوسائٹی میں موجود ہیں، ان کے ساتھ ماضی، حال اور مستقبل میں ہمارے معاملات اور تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ عیسائیت پر بات چل رہی ہے۔ آج اندلس کے حوالے سے بات ہوگی۔ اگلی نشستوں سے ان شاء اللہ دیگر مذاہب پر گفتگو ہوگی۔

اندلس یورپ کا ایک حصہ ہے، آج کل اس کو اسپین کہتے ہیں۔ اندلس اس دور کے ہسپانیہ کا ایک حصہ تھا۔ مراکش جو اقصیٰ مغرب کہلاتا ہے، اس سے آگے یورپ شروع ہوتا ہے جس میں اندلس ہے۔

افریقہ کی فتوحات حضرت عثمانؓ کے زمانے میں شروع ہوگئی تھیں۔ مراکش افریقہ کا حصہ ہے۔ افریقہ سے یورپ کی طرف بنوامیہ کے دور میں طارق بن زیادؒ، مسلم بن نصیرؒ وغیرہ جرنیلوں نے پیشرفت کی۔ یہ وہاں حملہ آور ہوکر علاقوں پر قبضہ کرتے تھے۔ یہ کام تقریبًا ۹۲ھ سے شروع ہوگیا تھا، یعنی جناب نبی کریمؐ کی رحلت کے ۸۰ سال بعد یورپ میں ہمارا داخلہ براستہ اندلس شروع ہوگیا تھا۔

بنواُمیہ اور بنوعباس کی کشمکش

بنوامیہ کی خلافت کے خلاف بنوعباس کی مہم ایک عرصے سے چل رہی تھی۔ یہ پرانی کشمکش تھی، بنو ہاشم بھی بنوامیہ کے خلاف لگے رہے، امام زیدؒ اور امام نفس زکیہؒ نے بھی خروج کیا، لیکن اس میں بنو عباس کا دائرہ اپنا تھا اور بنوعلی کا دائرہ اپنا تھا۔ بنوعلی کو باوجود خروج کے حکومت پر کنٹرول حاصل نہیں ہوا۔ بنوعباس بالآخر بنوامیہ کو گرانے میں اور ان کی جگہ اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ابوعبداللہ سفاح پہلے عباسی خلیفہ ہیں، ان کو سفاح اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بہت زیادہ خون ریزی کی تھی۔ اور جب ایک اقتدار گراکر دوسرا اقتدار جگہ لیتا ہے تو یہ فطری بات ہے، ایسے ہوتا ہے۔ اور یہ بھی واضح بات ہے کہ سب سے زیادہ قتل عام حریف کا ہوتا ہے۔ ملکہ سبا بلقیس نے جو کہا تھا ''ان الملوک اذا دخلوا قریة افسدوها وجعلوا اعزة اهلها اذلة وکذلک یفعلون'' (النمل ۳٤)

بادشاہوں کا سب سے پہلا ٹارگٹ یہ ہوتا ہے کہ پہلے اشرافیہ حکمران طبقات کو نیچے لانا۔

ضمناً کہہ دوں کہ یہاں بھی جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اقتدار سنبھالا اور پھر ۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی اقتدار آگیا تو چونکہ اقتدار مسلمانوں سے لیا تھا، اس لیے سب سے زیادہ نشانہ مسلمانوں کو ہی بنایا گیا۔ یہی بات بنوامیہ کے ساتھ ہوئی کہ بنوعباس نے بنوامیہ کے افراد کو چن چن کر قتل کیا، البتہ ان میں سے ایک شہزادہ سمجھدار نکلا، اس نے مزاحمت نہیں کی۔ اندلس کا علاقہ بنوامیہ کے ہی زمانہ میں فتح ہوا تھا، تو اس نے مزاحمت کرنے کی بجائے ایک طرف ہو کر یہ علاقہ سنبھال لینے کو ترجیح دی۔ وہ شہزادہ تھا عبدالرحمٰن بن معاویہ بن ہشام بن عبدالملک بن مروان۔ یہ چپکے سے وہاں سے نکلا، ظاہر بات ہے ہر آدمی کے کچھ حمایتی بھی ہوتے ہیں۔ تو یہ بچتا بچاتا اندلس جا پہنچا۔ اس کا یہ اندازہ صحیح تھا کہ چونکہ اندلس کا سارا انتظام انہی کے دور میں ہوا تھا تو وہ اس کی قدر کریں گے۔ اس نے اندلس کے ساحل پر اترتے ہی اپنی خلافت کا اعلان کر دیا کہ میں خاندانِ خلافت کا فرد ہوں اور خلیفہ کا پوتا ہوں، یہاں میں اپنی امارت کا اعلان کر رہا ہوں۔ وہاں مقامی حکمرانوں سے مزاحمت ہوئی لیکن عبدالرحمٰن نے بڑھتے بڑھتے ایک بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس کو عبدالرحمٰن الاول اور عبدالرحمٰن الداخل بھی کہتے ہیں۔ یہ اندلس میں بنوامیہ کی سلطنت کا بانی ہے۔ ۱۳۸ھ میں یہ اندلس میں داخل ہوا، جس اموی کو علم ہوا کہ عبدالرحمٰن الداخل نے اندلس میں حکومت قائم کر لی ہے، وہ وہاں جمع ہوتے چلے گئے اور ایک مستحکم حکومت قائم ہو گئی۔ ایک عرصہ تک انہوں نے حکومت کی، ۳۹۹ھ تک بنوامیہ کی وہاں حکومت رہی۔ دس خلیفہ گزرے ہیں، یہ بھی خلافتِ بنوامیہ کہلاتی ہے۔ فرق یہ تھا کہ خلافتِ بنوامیہ دمشق سے منتقل ہو کر اندلس چلی گئی اور بنوعباس نے خلافت قائم کر کے بغداد کو اپنا مرکز بنا لیا۔

اس کے بعد بنوامیہ خلفشار کا شکار ہوئے۔ مختلف خاندان قبضہ کرتے رہے، حکومتیں کرتے رہے۔ مثلاً بنوحنوط، پھر بنوعباد، پھر مرابطین، پھر موحدین، پھر بنوہود۔ طوائف الملوکی ہو گئی۔ اموی دور میں اندلس کی حکومت مستحکم تھی، اس نے بڑی ترقی کی اور اس دور کے اندلس کو آج بھی دنیا یاد کرتی ہے۔ اندلس تہذیب کا مرکز تھا۔ اِدھر مسلم تہذیب کا مرکز بغداد تھا اور اُدھر مسلم تہذیب کا مرکز غرناطہ اور قرطبہ تھا۔ اور تاریخ مانتی ہے کہ یورپ کو تہذیب و تمدن، حقوق اور تعلیم سے روشناس کرانے والا غرناطہ اور قرطبہ تھا۔ انہوں نے تقریباً تین سو سال وہاں حکومت کی۔ پھر غرناطہ الگ ہو گیا، قرطبہ الگ

ہو گیا۔ چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنتی گئیں لیکن مجموعی طور پر یہ اقتدار مسلمانوں کے ہی پاس رہا۔ عیسائیوں کے ساتھ بھی جنگیں ہوتی رہیں اور آپس میں بھی جنگیں ہوتی رہیں۔ چلتے چلتے ۸۹۷ھ میں مسلمانوں کو وہاں سے مکمل شکست ہوئی۔ غرناطہ میں ابو عبداللہ جو ہمارا آخری حاکم تھا، اس کا عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ ہوا، بادشاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازابیلا کے ساتھ، اور ابو عبداللہ وہاں سے نکل گیا۔

اس طرح ۹۲ھ سے شروع ہو کر ۸۹۷ھ تک تقریباً آٹھ سو سال مسلمانوں کی وہاں حکومت رہی، جس میں سے تین چار سو سال تو ہماری مستحکم حکومت تھی، پھر ہم وہاں سے رخصت ہوئے اور رخصت ہی ہو گئے۔ اس دوران یورپ پر اثرات کیا ہوئے اور ہم پر اثرات کیا ہوئے؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ اندلس پر بنو امیہ کی خلافت قائم ہونے کے بعد باقی علاقہ بنو عباس کے لیے آزاد ہو گیا تھا تو یہاں بنو امیہ نے بنو عباس سے مزاحمت نہیں کی۔ ساری معاصرت وہاں منتقل ہو گئی تھی۔ پھر بنو عباس سے ہلاکو خان نمٹا ہے۔ تاتاری آئے لیکن بنو امیہ سمندر پار دوسرے علاقے میں بڑی دلجمعی کے ساتھ حکومت کرتے رہے۔

یورپ کی حالتِ زار

اس دوران کے تاریخی حقائق یہ ہیں۔ یورپ کی مجموعی صورتحال یہ تھی کہ نہ وہاں تعلیم تھی، نہ ہنر تھا، نہ ہی حقوق تھے، مکمل جاہلیت کا منظر تھا۔ عرب جاہلیت سے بھی بدتر۔ یورپ میں حکمران (۱) بادشاہ تھا (۲) جاگیردار تھا (۳) پاپائے روم تھا۔ جاگیرداروں کے مزارعین جانوروں سے بدتر زندگی گزارتے تھے۔ بادشاہ مطلق العنان ہوتا تھا، جو کہہ دیا وہی قانون ہے، اور پاپائے روم ان کے پشت پناہ ہوتے تھے، مذہبی قیادت ان کا ساتھ دیتی تھی۔

وہاں جا کر علم کی بات سب سے پہلے مسلمانوں نے کی ہے۔ یورپ کے مؤرخ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں لیکن مسلمان کی بجائے عربوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمیں تعلیم، تہذیب، تمدن اور ثقافت سے روشناس عربوں نے کرایا۔ ہمیں ایک دوسرے کے حقوق کی پہچان عربوں نے کروائی۔ سائنس و ٹیکنالوجی اور صنعت و حرفت کی بنیاد عربوں نے رکھی۔ یہ بات وہ مانتے ہیں کہ یہاں کی تعلیم گاہیں پورے یورپ کی تعلیم کا مرکز تھیں۔ تقریباً تین چار صدیاں یہ ماحول رہا ہے کہ جس طرح آج ہمارے ہاں لوگ اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ، فرانس اور امریکہ وغیرہ جاتے ہیں، اس زمانے میں

پورے یورپ سے اعلیٰ تعلیم کے لیے غرناطہ، اندلس کا رخ کیا جاتا تھا۔ یہ مہذب اور تعلیم یافتہ ملک شمار ہوتا تھا۔ یورپ میں علم و دانش اور حقوق کا شعور داخل کرنے کا سبب اندلس بنا ہے۔

عباسی دور کی دستور سازی

میں ایک اور حوالے سے بات کرتا ہوں کہ یہ دور تھا جب ہماری چاروں فقہیں مرتب ہو کر مروّج ہو چکی تھیں۔ اللہ کی قدرت! تقسیم یہ ہوئی کہ حنفی فقہ کو عباسیوں نے اپنا لیا تھا۔ عباسیوں نے سب سے پہلے دستور مرتب کیا۔ ہمارے ہاں ایک بحث چلتی ہے کہ آیا دستور سازی جائز ہے؟ نہ معلوم کہاں سے ہم یہ تصورات لے لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں عباسیوں کے دور میں باقاعدہ دستور سازی اور قانون سازی ہوئی ہے۔ ہارون الرشید نے اپنے چیف جسٹس امام ابو یوسفؒ سے فرمائش کر کے کہا کہ میرے لیے نظمِ مملکت، مالیات وغیرہ کے قواعد و ضوابط مرتب کر دیں تاکہ میں ان کو نافذ کر دوں۔ چنانچہ امام ابو یوسفؒ نے ”کتاب الخراج“ لکھی جو بنیادی طور پر مالیات کے نظام پر ہے۔ اردو، عربی، انگلش بلکہ فرانسیسی میں اس کا ترجمہ موجود ہے۔ کتاب الخراج پڑھنے سے پہلے میں بھی یہی سمجھا کرتا تھا کہ اس میں کافروں سے خراج لینے کے متعلق مسائل ہوں گے لیکن اس میں پورا نظامِ معیشت ہے، بیت المال کا پورا سسٹم ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ عامل کا تقرر کیسے کرنا ہے، خلیفہ کیسے منتخب ہو گا، دستور، ایڈمنسٹریشن، مالیات اور عدالتی نظام پورے کا پورا اس میں موجود ہے۔

اس کو اگر سامنے رکھا جائے تو آج کی زبان میں وہ دستور ہی کہلائے گا۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اگر اس زمانے میں کوئی پارلیمنٹ بنائی جاتی کہ دستور مرتب کر دو، تو وہ یہی دستور مرتب کرتی جو اکیلے امام ابو یوسفؒ نے کر دیا۔ میں علماء کرام سے عرض کیا کرتا ہوں کہ سسٹم کے حوالے ہماری کلاسیکل کتابیں امام ابو یوسفؒ کی ”کتاب الخراج“، ابو عبید قاسم بن سلامؒ کی ”کتاب الاموال“، اور ماوردی اور قاضی ابو یعلیٰؒ کی ”الاحکام السلطانیہ“ (دونوں کی الاحکام السلطانیہ الگ الگ ہے)۔ ان میں قانون و دستور بھی ہے اور مالیات و عدلیہ بھی ہے۔ جبکہ لائبریریوں میں موجود ہوتے ہوئے بھی یہ چاروں کتابیں ہمارے مطالعے سے باہر ہیں۔ کہیں کوئی مضمون لکھنا پڑ جائے اور کوئی صفحہ کھول کر دیکھ لے تو الگ بات ورنہ ہم ان کتابوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ اور دنیا بھر میں یہ پروپیگنڈا سنتے رہتے ہیں کہ اسلام کے پاس کوئی سسٹم نہیں ہے، لیکن پڑھیں گے تو پتہ چلے گا۔

مسلم دنیا میں فقہی تقسیم

خلافتِ عباسیہ نے فقہ حنفی کو اپنا لیا، پوری خلافتِ عباسیہ میں فقہ حنفی ملک کا قانون رہی ہے۔ اس کے بعد ترکوں کی خلافتِ عثمانیہ آئی اس نے بھی فقہ حنفی کو ہی ریاستی قانون کا درجہ دیا۔ ہندوستان میں مغل حکومت تھی، ان کی فقہ بھی فقہ حنفی تھی۔ تین بڑے ایمپائر: عباسی ایمپائر، عثمانی ایمپائر اور مغل ایمپائر، ان میں فقہ حنفی قانون رہی ہے ۱۸۵۷ء تک۔

فقہ حنفی کے بہت سے امتیازات کی وجہ یہ ہے کہ عملاً قانون رہی ہے۔ جو قانون صرف کتابوں میں ہو اور سوسائٹی میں عملاً نہ ہو وہ قانون اور ہوتا ہے۔ اور جس قانون کو پریکٹیکل تجربات، مشاہدات اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے وہ قانون اور ہوتا ہے۔ جس قانون نے سوسائٹی میں عمل کرنا ہے اس کو رکاوٹیں بھی پیش آئیں گی، اس کو حل بھی نکالنا پڑے گا۔ فقہ حنفی پر سب سے بڑا الزام حیلہ کا ہے، حالانکہ قانون کو راستہ نکالنا پڑتا ہے، قانون میں ڈیڈلاک کبھی نہیں ہوا کہ چار دن قانون نہ سہی۔ یہ بات نہیں ہوتی، قانون کوئی نہ کوئی ہو گا۔ مشرق سارا فقہ حنفی پر عمل پیرا ہے۔

مغربی افریقہ میں فقہ مالکی نے حکمرانی کی ہے، اب بھی مراکش، لیبیا، تیونس میں فقہ مالکی ہے۔

جبکہ بمبئی سے آگے ملائیشیا، تھائی لینڈ اور انڈونیشیا کے آخر تک سارے شافعی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق پچیس تیس کروڑ شافعی ہیں اس خطے میں۔ بمبئی سے شوافع شروع ہوتے ہیں، بمبئی میں بھی شوافع بہت ہیں بڑی مضبوط کمیونٹی ہے شوافع کی۔ دہلی میں حنفی ہیں اور لکھنؤ میں شیعہ۔ یہ تکون صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔

فقہ کی درسِ نظامی میں ابتدائی کتاب ”مالابد منہ“ حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی لکھی ہوئی ہے۔ میں ایک دن لندن کی ایک مسجد میں تھا، مغربی ماحول میں ہوتا یہ ہے کہ جہاں لوگ کہیں جا کر بستے ہیں، ان کے پاس جو اپنی کتابیں ہوتی ہیں اگلی نسل کے لیے وہ کتابیں بیکار ہوتی ہیں، زبان کے لحاظ سے بھی اور ذوق کے اعتبار سے بھی، ان کے کسی کام کی نہیں ہوتیں۔ وہ اول تو پھینک دیتے ہیں یا بہت زیادہ احترام کریں گے تو قریب کی مسجد میں چھوڑ آئیں گے۔ میں نے بہت سی کتابیں مسجدوں سے اٹھائی ہیں۔ مجھے لندن کی مسجد میں ”مالابد منہ شافعی“ ملی۔ میں چونکا کہ مالابد منہ تو حنفیوں کی ہے، یہ شافعیوں کی کدھر سے آ گئی۔ وہ بالکل اسی ضخامت کی، اسی زمانے کی، اسی لہجے میں، اسی انداز و

ترتیب سے فارسی زبان میں تھی، اس میں شافعی فقہ بیان کی گئی تھی۔ میں نے ہدیہ مسجد میں شامل کر کے وہ کتاب لے لی۔ میرے لیے یہ بالکل نئی چیز تھی۔

ہم حنفی، مالکیہ اور شوافع کے درمیان گھرے ہوئے ہیں۔ مغرب میں مالکیہ اور مشرق میں شوافع ہیں، درمیان میں ایک چھوٹی سی پٹی حنابلہ کی ہے، سعودیہ اور عرب امارات۔ مصر میں بھی زیادہ شوافع ہیں۔ اندلس نے بڑے بڑے علماء پیدا کیے ہیں مثلاً امام قرطبیؒ اور ابن خلدونؒ وغیرہ۔

علم کا تعارف مغرب کو مسلمانوں نے کرایا ہے۔ سائنس اور صنعت و حرفت کی بنیاد بھی مسلمانوں نے فراہم کی ہے، اور حقوق کا تعارف بھی مسلمانوں نے کروایا۔ مغرب اس کا اعتراف کرتا ہے۔ جب کسی قوم کا دور ہوتا ہے تو ابتدائی ایک سو سال اس کے ارتقا کا زمانہ ہوتا ہے، اور آخری سو، سوا سو سال تنزل کا زمانہ ہوتا ہے۔ عروج کا زمانہ درمیان کا ہوتا ہے۔ جیسے بنوامیہ کے اس آٹھ سو سال کے دور میں عروج کا دور تین سو سال کا تھا۔

علم و فلسفہ کی پشت پناہی کے لیے طاقت کی ضرورت

علم، تہذیب، تمدن، فلسفہ کے لیے طاقت کی پشت پناہی ضروری ہوتی ہے، ورنہ ختم ہو جاتا ہے۔ صرف علم، صرف تہذیب، صرف فلسفہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ ہم نے اگر دنیا پر ہزار سال حکومت کی ہے تو ہماری بنیاد علم اور اخلاقیات پر تھی، لیکن پشت پناہ طاقت و حکومت تھی۔ آج اگر دنیا پر مغرب کا فلسفہ حکمرانی کر رہا ہے، ہماری خواہشات کے علی الرغم کر رہا ہے، ہمارا ایک لمحہ کے لیے بھی جی نہیں چاہتا کہ ہم مغربی فلسفے کو قبول کریں لیکن ہمیں قبول کرنا پڑ رہا ہے، کیونکہ اس کی پشت پناہی طاقت کر رہی ہے۔ مغرب کا فلسفہ تمام تر کمزوریوں کے باوجود، تمام تر اعتراضات کے باوجود، دنیا کی مختلف قوموں کے تمام تر تحفظات کے باوجود دنیا کا حکمران ہے، جس کے سامنے چین بھی بے بس ہے۔ چین معیشت کے میدان میں ٹکر لے رہا ہے، فلسفے اور تہذیب و تمدن کے محاذ پر وہ وہیں کھڑا ہے جہاں مغرب کھڑا ہے۔ یہ سب کچھ طاقت کے بل بوتے پر ہو رہا ہے۔ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے ؂

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

نبوت کے ساتھ بھی طاقت ضروری ہے، حضرت داؤد علیہ السلام طاقت کے ذریعے ہی خلیفہ بنے۔ خلیفہ بننے کے لیے جالوت کو قتل کرنا پڑا تھا ”وقتل داوود جالوت وأتاه الله الملك

والحکمۃ وعلمہ مما یشاء" (البقرہ ۲۵۱)۔ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں پہلے انہوں نے جالوت کو قتل کیا پھر میں نے ان کو حکومت، نبوت اور خلافت دی تھی۔ دنیا کا مذہب، دین، عقیدہ آسمان سے آتا ہے، دنیا میں طاقت ملتی ہے تو نظام چلتا ہے۔ اور ہم آج مار کھا رہے ہیں طاقت نہ ہونے کی وجہ سے کہ طاقت کا توازن ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ جس قوم کے پاس طاقت کا توازن نہیں ہے وہ خود اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی، دوسروں پر حکومت کیا کرے گی! قرآن کریم کے ایک نکتے کی طرف اشارہ کروں گا، قرآن کریم نے طاقت کا معیار بتایا ہے "واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم وآخرین من دونھم" (الانفال ۶۰)۔ قوت کا ترجمہ حضورؐ نے کیا تھا "الا ان القوۃ ھی الرمی" قوت رمی کا نام ہے۔ رمی کا معنی پھینکنا، رمی سے مراد ہتھیار پہنچانے اور پھینکنے کی صلاحیت۔

آج کی دنیا میں سب سے بڑی دوڑ اس بات میں ہے کہ میرے میزائل کی چھ ہزار میل تک رسائی ہے، دوسرا کہتا ہے میرے میزائل کی رسائی آٹھ ہزار میل تک ہے۔ میزائل کی رینج کس کی کتنی ہے، آج کی قوت یہ ہے۔ آج کی جدید ترین سائنس بھی قوت کا معیار میزائل کی رینج کو قرار دیے ہوئے ہے۔ اور رباط الخیل سے مراد لاجسٹک سورسز (نقل و حرکت کے ذرائع) ہیں۔ اس زمانے میں گھوڑے، خچر اور اونٹ ہوتے تھے، اس لیے رباط الخیل کہا۔ آج طیارے ہیں، بحری جہاز ہیں۔ اب میزائل کی رینج اور لاجسٹک سورسز کے ساتھ ایک اور طاقت کا اضافہ ہو گیا ہے، وہ ہے معلومات تک رسائی اور معلومات کا پھیلاؤ۔ یعنی انٹرنیٹ، کہ آپ معلومات کے حصول اور پھیلاؤ پر کتنی جلدی اور کتنی مکمل رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

دشمن کے خلاف کتنی طاقت مہیا کرو؟ اس کا معیار یہ بتایا "ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم" اتنی طاقت کہ تم دہشت پھیلا سکو، جس کے ساتھ تم دشمن کو رعب میں رکھ سکو۔ ارہاب دہشت کو کہتے ہیں، دہشت گردوں کو ارہابیین کہتے ہیں۔ اس آیت کا سادا سا ترجمہ یہ کیا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جتنے تمہارے پاس وسائل ہیں سارے خرچ کرو، قوت پیدا کرو، لاجسٹک سورسز پیدا کرو۔ اتنے کہ طاقت کا توازن تمہارے ہاتھ میں ہو۔ جب طاقت کا توازن ہمارے ہاتھ میں تھا، ہم نے حکمرانی کی

ہے۔ ہم نے طاقت کا توازن کھو دیا، اب جس کے پاس ہے وہ حکمرانی کر رہا ہے۔

سائنس و ٹیکنالوجی اور مسلم سلطنتوں کا طرزِ عمل

- ہماری حکومتوں میں سے دو حکومتوں نے اس طرف کوئی توجہ دی ہے۔ ایک نے بالکل ابتدائی درجے میں یعنی عباسیوں نے۔ سائنسی ایجادات، سائنسی مطالعہ کا آغاز عباسیوں کے دور میں ہوا۔ انہوں نے رسد گاہ بنائی۔ رسد گاہ کیا تھی؟ ہمارے ہاں ستاروں وغیرہ کے علوم عقلیات کے دائرے میں تھے، اس کو مشاہدات کے دائرے میں لانے کے لیے سب سے پہلا کام عباسیوں نے کیا ہے۔ ادھر اندلس میں بنو امیہ تھے۔ دونوں معاصر تھے ان دونوں نے اس طرف توجہ دی۔
- پھر ہماری دو حکومتوں نے اس طرف توجہ نہیں دی جس کی ہم مار کھا رہے ہیں۔ نہ خلافتِ عثمانیہ نے اس کو اپنا ایجنڈا بنایا، نہ مغلوں نے بنایا۔ یورپ نے انگڑائی لی اندلس کی وجہ سے، لیکن اس کے متبادل جو ہماری حکومت یورپ کے ایک حصے ترکی میں بنی، یہ بے خبر رہی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی پر کوئی توجہ نہ دی، ادھر مغلوں نے بھی یہی کیا۔

میرا تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر ایک موقف ہے اور بے بنیاد نہیں ہے کہ یورپ کو حقوق، عمرانیات اور سماجیات سے اندلس نے متعارف کرایا، سائنس اور ٹیکنالوجی سے بھی اندلس نے متعارف کروایا۔ یہ تو ہمارا کریڈٹ ہے، کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ جب بنیادیں فراہم کر کے عمارت شروع کرنے کا وقت آیا تو ہم اندلس سے بے دخل ہو گئے کہ ہماری سیاسی قوت نہیں رہی تھی، عسکری قوت شکست کھا گئی تھی۔ اور جس فلسفے اور نظام کے پیچھے سیاسی اور عسکری قوت نہ ہو اس کا حال وہی ہوتا ہے جو ہمارا اندلس میں ہوا۔ بنیادیں ہم نے قائم کیں، عمارت یورپ نے کھڑی کر دی۔ اصول ہم نے فراہم کیے، ڈھانچہ انہوں نے بنا لیا۔ آج جو بھی چیز دیکھیں گے اس کے پیچھے اندلس، غرناطہ اور قرطبہ نظر آئے گا۔ لیکن جب ہم اپنی سیاسی و عسکری قوت برقرار نہیں رکھ سکے تو وہی ہونا تھا جو ہوا۔

بغداد میں ہلاکو خان نے ہماری تباہی کا سامان کیا اور اندلس میں فرڈیننڈ اور ملکہ ازبیلا نے کیا۔ جب ابو عبداللہ غرناطہ کی پہاڑیوں سے رخصت ہوئے، جلاوطن کر دیے گئے تو پھر ازابیلا ملکہ تھی اور بادشاہ

فرڈینینڈ تھا۔ ان میاں بیوی نے ہم پر فتح پائی تھی، انہوں نے باقاعدہ نوٹس دے دیا، اعلان کر دیا کہ یا عیسائی ہو جاؤ یا ملک چھوڑ دو ورنہ قتل کر دیں گے۔ یہ مہذب ملکوں کی بنیاد ہے، لاکھوں لوگ قتل کیے، لاکھوں بھاگے، لاکھوں عیسائی ہوئے۔ امریکہ میں جانے والے کالوں کی اور اسپینش کی ایک بڑی تعداد مسلمان تھی جو وہاں جا کر عیسائی ہوئے۔ ہم پر یہ اثرات ہوئے کہ ہم نے علم کی ترقی اور سائنس و ٹیکنالوجی کی طرف اور قرآن کریم کے اس ارشاد "واعدوا لهم ما استطعتم من قوة و من رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم" کی طرف جو قدم بڑھانا شروع کیا تھا، ادھر ہلاکو خان نے اور ادھر فرڈینینڈ اور ازابیلا نے ہمیں تہس نہس کر دیا اور ہمارے قدم وہیں رک گئے۔ اور ایسے رکے کہ ابھی تک رکے ہوئے ہیں۔ ابھی تک اجارہ داری انہی کی ہے، ابھی تک وہی ہم پر حکمرانی کر رہے ہیں۔

امریکہ کی دریافت

امریکہ کی دریافت اس دوران ہوئی جب اندلس میں ہمیں شکست ہو گئی تھی۔ یہ ۱۴۹۰ء کا دور تھا، شاہ فرڈینینڈ اور ملکہ ازابیلا اسپین کے بادشاہ اور ملکہ نے اندلس میں ہمیں شکست دے کر اندلس کو خالی کرا لیا تھا۔ امریکہ کو دریافت کرنے والا کولمبس شاہ فرڈینینڈ اور ملکہ ازابیلا کا نمائندہ تھا، اس کے خرچے اور اجازت سے ہند کو دریافت کرنے نکلا تھا لیکن اس کا رخ ادھر ہو گیا اور وہ امریکہ جا پہنچا۔ اس کا تو اسے پتہ بھی نہیں تھا کہ یہ بھی دنیا میں کوئی برِاعظم ہے۔ پرانے زمانے میں سمندری سفر اسی طرح ہوا کے رخ پر ہوتا تھا، ہوا کا رخ بدل گیا تو سفر کا رخ بھی بدل گیا۔ جیسے بخاری کی روایت میں ہے، ابو موسٰی اشعریؓ کہتے ہیں کہ ہم سمندری راستے سے مدینہ کی طرف چلے تھے، ہوا کا رخ بدلا تو ہم حبشہ جا پہنچے، کافی عرصہ وہاں رہنا پڑا۔ اسی طرح کولمبس امریکہ جا پہنچا۔

تاریخ یہ کہتی ہے کہ کولمبس سے پہلے عرب وہاں پہنچے تھے۔ یہ ایک تاریخی تنازعہ ہے کہ امریکہ عربوں نے دریافت کیا یا کولمبس نے دریافت کیا۔ لیکن یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ جب کولمبس وہاں پہنچا تو اسپینش عرب وہاں موجود تھے۔ امریکہ میں دوسری بڑی نیشنلٹی اسپینش کی ہے، دوسری سرکاری زبان اسپینش ہے۔

اندلس میں شکست کے بعد مسلمانوں کے لیے راستہ

یہ کہا جاتا ہے اور شواہد بھی موجود ہیں کہ اندلس پر قبضہ کرنے کے بعد جب شاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازابیلا نے وہاں جبراً لوگوں کو عیسائی بنایا تھا اور یہ آرڈر دیا تھا کہ ایک ماہ کے اندر اسپین چھوڑ دو، عیسائی ہو جاؤ، یا پھر قتل ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اندلس کی غالب اکثریت کو انہوں نے عیسائی بنا لیا تھا، بڑی تعداد کو قتل کر دیا تھا، بہت سے لوگ بھاگ گئے تھے۔ بھاگنے کا راستہ سمندر ہی تھا۔ اس کی ایک جھلک روہنگیا ارکان کی کشمکش میں دکھائی دیتی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسپین والے کیسے بھاگے تھے، لیکن روہنگیا مسلمانوں کا معاملہ دیکھ کر بات سمجھ میں آ گئی۔ برما والے انہیں دھکیل رہے تھے، بنگلہ دیش والے انہیں قبول نہیں کر رہے تھے، بہت سے لوگ سمندر میں ڈوب گئے، کچھ کو کہیں پناہ مل گئی۔ ایسے ہی اسپین کے مسلمان ایمان بچانے کے لیے وہاں سے بھاگ نکلے، بہت سے لوگ سمندر میں ڈوب گئے اور بہت سے امریکہ پہنچ گئے۔ اکثر وہ ہیں جن کو اس زمانے میں اسپین سے نکال دیا گیا تھا۔ آج کے اسپینش انہی کی اولاد ہیں لیکن اکثر مسلمان نہیں ہیں، غالب اکثریت عیسائی ہو گئی ہے۔

امریکہ کی ہسپانوی نسل کے مسلمان

اسپینش نسل کی دو چھوٹی چھوٹی شہادتیں میرے سامنے بھی ہیں:

۱۹۸۷ء کی بات ہے جب میں پہلی بار امریکہ گیا، نیویارک میں گوجرانوالہ کے ہمارے ایک دوست تھے ڈاکٹر زاہد، ان کا وہاں کلینک تھا، ایک دن کہنے لگے لوگ تو یہاں سفر کر کے چیک اپ کرانے کے لیے آتے ہیں، آپ آئے ہوئے ہیں تو میرے کلینک پر چیک اپ کرا لیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے کر لیں۔ انہوں نے مجھے دوسرے دن دس بجے کا وقت دے دیا کہ آپ آ جائیں اور عملے سے کہہ دیا کہ مولوی صاحب آئیں گے، ان کا چیک اپ کرنا ہے۔ چیک اپ کے لیے میرا خون لینے والی لڑکی اسپینش تھی، اس نے ٹیسٹ کے لیے میری رگ سے خون نکالنا تھا۔ جب اس نے سوئی چبھوئی تو میں نے کوئی قرآنی دعا پڑھی۔ اب مجھے یاد نہیں کون سی دعا پڑھی تھی۔ اس نے خون شیشی میں لیا، میں اٹھ کر چلا گیا۔ دوسرے دن ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے پوچھا آپ نے خون نکالنے والی لڑکی کو کیا کہا تھا۔ میں نے کہا میں نے تو اسے کچھ نہیں کہا۔ کہنے لگے آپ نے کچھ کہا تھا۔ میں نے کہا نہ میں اس کی زبان

سمجھتا ہوں، نہ وہ میری زبان سمجھتی ہے، میں نے اسے کیا کہنا تھا۔ انہوں نے کہا، وہ کہہ رہی ہے کہ مولوی صاحب سے پوچھیں جب میں نے سوئی چبھوئی تھی تو مولوی صاحب نے کیا کہا تھا۔ میں نے بتایا کہ میں نے تو دعا پڑھی تھی۔ اس نے کہا، جو الفاظ مولوی صاحب نے بولے تھے ویسے میری دادی مجھے گود میں لے کر بولا کرتی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کی دادی مسلمان تھی۔

دوسرا ذاتی مشاہدہ یہ ہے کہ شکاگو (امریکہ) میں فیصل آباد کے ایک اہلِ حدیث بزرگ تھے حافظ محمد صدیق انور، ہمارے دوست تھے، ایک اردو اخبار ''پاکستانی'' کے نام سے شکاگو سے نکالتے تھے۔ ۱۹۹۰ء کی بات ہے میں شکاگو میں ان کے پاس ٹھہرا ہوا تھا کہ ان کے پڑوس سے ایک لڑکا آیا۔ انہوں نے کہا اس کا نام علی ہے۔ وہ عیسائی لڑکا تھا، اب ظاہر بات ہے مجھے تردد ہوا کہ عیسائیوں میں علی کہاں سے آگیا۔ میں نے کہا اسے بلائیں۔ اس کو بلایا، اس کا نام پوچھا اس نے بتایا علی۔ میں نے پوچھا علی کس کے نام پر نام رکھا ہے۔ تحقیق سے پتہ چلا کہ اس کے پردادا کا نام علی تھا۔

عیسائیوں کے ساتھ ہمارا یہ معاملہ بھی چلتا رہا۔ مسلمان اسپین سے نکل کر امریکہ وغیرہ جا کر آباد ہوئے۔

تلخ داستانیں

حضرات علماء کرام! بڑی تلخ داستانیں ہیں، دل بہت کڑھتا ہے لیکن واقف تو ہونا ہی پڑتا ہے۔ آج میں نے اندلس کے حوالے سے بات کی ہے۔ ایک بات میں شہزادہ چارلس کی نقل کرنا چاہوں گا۔ شہزادہ چارلس برطانیہ کے ولی عہد ہیں، ستر پچھتر سال کے ہوگئے ہیں۔ اب حکمرانی کیا کریں گے، لیکچر دیتے ہیں۔ انہوں نے ایک لیکچر میں کہا تھا کہ اندلس ہمارا استاد ہے، ہم نے جو سیکھا ہے اندلس سے سیکھا ہے، ہمیں جو علم اور روشنی ملی ہے اندلس سے ملی ہے۔ لیکن ہم مسلمان دوسروں کو روشنی دے کر خود اندھیروں میں بھٹک گئے، یہ ہمارا ایک المیہ ہے۔ عیسائی مسلم تعلقات کا یہ بھی حصہ ہے۔ اندلس میں یہ کشمکش چلتی رہی، بالآخر وہ غالب آگئے اور ایسے غالب آئے کہ ہر چیز تبدیل کر دی۔ غرناطہ اور قرطبہ میں ابھی تک علی اسٹریٹ، عمر روڈ موجود ہیں۔ میرا وہاں جانے کو جی نہیں چاہتا کہ میں اندلس میں عمر روڈ پر کیسے چلوں گا، میرا حوصلہ نہیں ہے۔ میں وہاں عائشہ اسٹریٹ میں کیسے چلوں گا کہ وہاں کوئی عائشہ نظر نہ آئے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

صلیبی جنگیں

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ حضرات علماء کرام! مسیحیت کے بارے میں بات چل رہی ہے۔ یہ فرق ذہن میں رہنا چاہیے کہ ہم انہیں عیسائی کہتے ہیں تو وہ اس بات کو ناپسند کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں مسیحی کہا کریں۔ ہمیں ان کو مسیحی کہنے میں کوئی اشکال نہیں ہے کہ وہ مسیحی بھی ہیں۔ دورِ نبویؐ میں مسلم مسیحی تنازعات جس کی ابتدا موتہ اور تبوک سے ہوئی، پھر دورِ خلافتِ راشدہ میں اور دورِ بنوعباس میں، جبکہ یہ مسلم مسیحی تنازعات ابھی تک چل رہے ہیں۔ بعض حضرات اسے فائنل راؤنڈ کہہ رہے ہیں، میں اسے سیمی فائنل راؤنڈ کہتا ہوں کہ یہ آخری راؤنڈ سے پچھلا راؤنڈ ہے، اس کے بعد پھر اگلا مرحلہ ہوگا۔

ایک اصطلاح ہمارے ہاں چلتی ہے صلیبی جنگوں (Crusades) کی، یہ کیا تھیں؟ آج اس حوالے سے بات کرنا چاہوں گا کہ صلیبی جنگوں کا پس منظر، مقاصد اور نتائج کیا تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ''انتقال''

صلیب ''کراس'' کو کہتے ہیں جو اُن کے ہاں مقدس مذہبی علامت ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سولی پر چڑھ گئے تھے، ان پر موت آگئی تھی، تین دن قبر میں رہے، اس کے بعد قبر پھٹی اور وہ قبر سے نکل کر آسمانوں پر چلے گئے۔ ہمارے اور عیسائی دونوں کے عقیدے میں یہ بات ہے کہ اس وقت حضرت عیسیٰؑ زندہ آسمانوں پر موجود ہیں، قیامت سے پہلے تشریف لائیں گے، اس عقیدے میں دونوں متفق ہیں۔ لیکن ہمارے اور ان کے عقیدے میں بنیادی فرق یہ ہے کہ:

- ان کا کہنا ہے حضرت عیسیٰؑ سولی پر چڑھ گئے تھے، ان پر موت آگئی تھی، تین دن قبر میں رہے تھے، تین دن بعد قبر پھٹی، وہ قبر سے نکلے اور دوبارہ زندگی کے ساتھ آسمانوں پر چلے گئے۔
- جبکہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ''وما قتلوہ وما صلبوہ ولٰکن شبہ لھم'' (النساء ۱۵۷) ان پر نہ موت آئی، نہ قتل ہوئے، نہ سولی چڑھے ''بل رفعہ اللہ الیہ'' (النساء ۱۵۸) بلکہ پہلی زندگی کے ساتھ ہی آپؑ زندہ آسمانوں پر اٹھا لیے گئے، یہودیوں کو شبہ میں ڈال دیا

گیا۔

صلیب سولی کا نشان ہے، اس زمانے میں سولی پر لٹکایا جاتا تھا۔ یہ عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کی صلیب (سولی) کی علامت ہے، اور یہ ان کا سب سے مقدس نشان ہے، اس کی حرمت پر وہ سارے کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

عیسائی فرقوں کی عملداری

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب بیت المقدس مسلمانوں کی تحویل میں آ گیا تھا اور عیسائیت دو حصوں میں تقسیم تھی: مغربی یورپ (اٹلی، فرانس وغیرہ) اور مشرقی یورپ (ترکی، یونان وغیرہ)۔ ان کی آپس میں چپقلش چلتی رہتی تھی:

۱. مغربی یورپ میں پاپائے روم کی حکمرانی تھی۔ کیتھولک پیشوا، سیاسی بھی، مذہبی بھی۔ مغربی یورپ کا مرکز روم اور پاپائے روم تھا۔

۲. مشرقی یورپ میں قسطنطنیہ (استنبول) کا علاقہ مشرقی رومہ کہلاتا تھا۔ اس کی قیادت قسطنطنیہ کے چرچ کے پاس تھی اور قسطنطین ان کا عیسائی بادشاہ تھا جس نے شہر کو ترقی دی تھی اور اسے اپنا مرکز بنایا۔ یہ اسلام کے دور سے پہلے کی بات ہے، اس بادشاہ کے نام سے قسطنطنیہ ہے۔ یہ ایک عرصہ سے دارالحکومت چلا آ رہا ہے۔ مشرقی یورپ کا یہ مرکز تھا۔

صلیبی جنگوں کا پس منظر

بغداد خلافتِ عباسیہ میں دارالحکومت تھا، ایک دور میں اس کو دنیا کے سیاسی مرکز کی حیثیت حاصل تھی، تمدن، تعلیم، ثقافت اور سیاست ہر لحاظ سے۔ لیکن عباسی خلفاء معاملہ سنبھال نہ سکے اور بغداد کا علاقہ تاتاریوں کے ہاتھوں تاراج و برباد ہو گیا۔

اس کے بعد بغداد پر ترک سلجوقی حکمرانوں کی حکومت رہی۔ اس زمانے میں جب عباسی خلافت ختم ہو گئی تو خلافت کا ٹائٹل مصر کے بنو فاطمہ نے اختیار کر لیا تھا۔ یہ حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں سے اہلِ تشیع تھے۔ مصر پر ان کی حکومت کافی عرصہ تقریباً دو سو سال تک رہی ہے، یہ دولت بنی فاطمہ کہلاتی تھی۔ ایک دور میں بنو فاطمہ کی حکومت حجاز، مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ پر بھی رہی ہے۔ خلافتِ عباسیہ

کے بعد مصر میں بنو فاطمہ، اور بغداد میں سلجوقی حکمران تھے۔ سلجوقیوں کی لڑائی ادھر بنو فاطمہ سے رہتی تھی اور ادھر مغربی یورپ کے عیسائیوں کے ساتھ بھی رہتی تھی۔

ا. مؤرخین صلیبی جنگوں ایک کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ جب سلجوقیوں نے دولتِ بنی فاطمہ سے ان کی حکومت چھینی، صلاح الدین ایوبیؒ انہی کی طرف سے تھا، اور صلاح الدین ایوبیؒ کے ہاتھوں دولتِ بنی فاطمہ ختم ہوئی تو ان کے باقی ماندہ لوگوں نے پاپائے روم سے مدد کی درخواست کی۔ اِدھر سے سلجوقیوں نے ترکی کا دائرہ تنگ کر رکھا تھا اور مشرقی یورپ کے عیسائی بھی ان سے تنگ تھے، انہوں نے بھی پاپائے روم سے مدد کی درخواست کی۔ قسطنطنیہ اور پاپائے روم آپس میں حریف اور مقابل تھے لیکن سلجوقی حکمرانوں کے سامنے خود کو بے بس پاکر مشرقی یورپ نے مغربی یورپ کی پاپائیت سے ہاتھ ملا لیا کہ ہماری مدد کرو۔ ادھر سے بنی فاطمہ مدد کی درخواست کر رہے تھے، اُدھر سے مشرقی یورپ والے عیسائی مدد کی درخواست کر رہے تھے۔ اس سے پاپائے روم کو مداخلت کا موقع مل گیا، مغربی یورپ کا حکمران تو وہ تھا ہی۔ صلیبی جنگوں کا ایک سبب تو یہ ہے۔

۲. دوسرا سبب مؤرخین یہ بتاتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بیت المقدس جب مسلمانوں کی تحویل میں آیا تو مسلمانوں نے عیسائیوں کو یہ آزادی دی تھی کہ یہاں آئیں، عبادت کریں اور اپنے مقدس مقامات کی زیارت کریں، لیکن رہ نہیں سکتے۔ بیت اللحم عیسائیوں کا قبلہ ہے جو بیت المقدس سے چند کلو میٹر بتاتے ہیں۔ عیسائیوں کے لیے بہت مقدس مقام ہے اور اس لحاظ سے کہ حضرت عیسیٰؑ کی جائے ولادت ہے "مکانًا شرقیا" کہہ کر قرآن کریم نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس لحاظ ہمارے لیے بھی قابلِ احترام مقام ہے۔ بیت اللحم ہمارا قبلہ تو نہیں ہے لیکن قابلِ احترام تو ہے کہ اس کی نسبت حضرت عیسیٰؑ کی طرف ہے۔ اسی طرح صہیونیت (صہیون ازم) یہودیوں کا ٹائٹل ہے۔ صہیون بیت المقدس کی ایک پہاڑی کا نام ہے جو حضرت داؤدؑ کی عبادت گاہ تھی، آج بھی اس کے آثار ملتے ہیں۔ یہودیوں نے اپنی تحریک کی نسبت صہیون کی طرف کی۔ اگر وہ حضرت داؤدؑ کی عبادت گاہ تھی تو ہمارے لیے بھی قابلِ احترام ہے، ہم اس لیے اس کی توہین نہیں کر سکتے کہ

یہودیوں نے اس کو اپنا ٹائٹل بنالیا ہے۔ حضرت داوٗدؑ کو ہم بھی اللہ کا پیغمبر مانتے ہیں، ان کا احترام کرتے ہیں۔

بیت اللحم عیسائیوں کا قبلہ ہے اور بیت المقدس بھی ان کا پرانا قبلہ ہے کہ یہ یہودیت سے نکلے ہیں۔ اس حوالے سے عیسائی زیارت کے لیے آیا کرتے تھے۔ ایسے ہی سمجھ لیں کہ اسرائیل کو ہم نے تسلیم نہیں کیا، جبکہ بہت سے مسلم ممالک نے تسلیم کیا ہوا ہے۔ بیت المقدس اسرائیل کے کنٹرول میں ہے لیکن جن ممالک نے اسرائیل کو تسلیم کیا ہوا ہے ان کے لوگ بیت المقدس کی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ترکی کے صدر طیب اردگان کا بیان ہمیں تو عجیب سا لگا لیکن ان کی بات ٹھیک ہے کہ مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ بیت المقدس جانا چاہیے تاکہ مسلمانوں کی نسبت اس سے نمایاں ہو۔ ہمیں اس لیے سمجھ نہیں آیا کہ ہم اسرائیل جا نہیں سکتے۔ بہرحال اسی طرح عیسائی وہاں آتے جاتے تھے۔ سلجوقیوں نے بنوفاطمہ کے بعد اس پر کنٹرول کیا تو انہوں نے کچھ پابندیاں لگا دیں کہ آنے جانے کی اجازت تو تھی مگر راستوں کی پابندی تھی کہ فلاں راستے سے آؤ جاؤ گے۔ سکیورٹی کے طور پر یا جیسے بھی، بہرحال کچھ پابندیاں لگا دیں۔ وہ پابندیاں عنوان بن گئیں کہ ہمیں بیت المقدس جانے سے روکا جارہا ہے اور پابندیاں لگائی جارہی ہیں۔ یہ دو تین معاملے اکٹھے ہو گئے۔

پوپ اربن ثانی کا فتویٰ ''جہاد''

یہ پانچویں صدی ہجری کے آخری عشرہ کا دور تھا اور میلادی سن کے لحاظ سے گیارہویں صدی عیسوی کا آخر تھا۔ ۱۰۹۴ء، ۱۰۹۵ء کی بات ہے۔ اس وقت پاپائے روم تھے پوپ اربن ثانی، فرانسیسی تھے، ان سے قسطنطنیہ والوں نے، بنوفاطمہ والوں نے اور پادریوں نے بھی درخواست کی کہ ہمارے راستے بند کیے جا رہے ہیں۔ تو اربن ثانی نے اس ٹائٹل سے کہ ہمارے بیت المقدس آنے جانے پر رکاوٹیں نہیں ہونی چاہئیں، انہوں نے صلیب کے نام پر تحریک شروع کی۔ بعد میں دعویٰ یہ ہو گیا کہ فلسطین ہماری زمین ہے، ہم نے وہاں واپس جانا ہے اور فلسطین پر قبضہ کرنا ہے۔

اس کا اعلان اربن ثانی نے فرانس میں کلیئر ماؤنٹ کے مقام پر ۱۰۹۵ء میں کیا تھا۔ بہت بڑا عالمی اجتماع کیا اور اس میں صلیب اٹھا کر اعلان کیا کہ اس صلیب کے تقدس اور اس کی بالادستی کے لیے ہم ان کافروں (یعنی مسلمانوں) کے خلاف جہاد کریں گے، اور کہا کہ یہ مقدس صلیبی جنگ ہے۔ اور

مشرقی و مغربی تمام یورپ کے بادشاہوں سے کہا کہ میں جہاد کا فتویٰ دیتا ہوں اور تمہیں حکم دیتا ہوں کہ مشترک ہو کر جہاد کے لیے چلو اور اس علاقے پر کنٹرول حاصل کرو۔ اس کے اعلان کا اردو انسائیکلو پیڈیا سے ایک جملہ نقل کرتا ہوں۔ اس نے کہا:

> "بیت المقدس کو بہانہ بناؤ اور سرزمینِ مقدس مسلمانوں سے چھین کر خود اس کے مالک بن جاؤ، یہ سرزمین تمہاری ہے، ان کافروں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس مقدس سرزمین کے بارے میں تورات کا کہنا ہے کہ اس میں دودھ اور شہد کی نہریں جاری ہیں"۔

اس پر جرمنی، فرانس اور برطانیہ کے حکمران اکٹھے ہوئے، ان کی مشترکہ فوج تیار ہوئی۔ انہوں نے ۱۰۹۶ء میں پوپ کے اعلان کے اگلے سال پہلا حملہ کیا جو بہت بڑی یلغار تھی۔ پہلے حملہ میں ہی انہوں نے اس علاقے میں اپنی چار ریاستیں بنالیں: انطاکیہ، طرابلس، الریحاء اور بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔

ادھر یہ حال تھا کہ عباسیہ خلافتِ ختم ہو چکی تھی، ہماری قوتیں متفرق تھیں اور کوئی مضبوط قوت سامنے نہیں تھی۔ شام میں کوئی اور، مصر میں کوئی اور، عراق میں کوئی اور۔ ہماری مختلف حکومتیں تھیں زنگی، سلجوقی وغیرہ۔ یہاں سے پھر شام والے جاگے ہیں، نور الدین زنگی، عماد الدین زنگی، پھر صلاح الدین ایوبی رحمہم اللہ تعالیٰ۔ یہ شام کے علاقائی حکمران تھے، ان کو خیال آیا تو انہوں نے مقابلے کی تیاری کی۔ صلیبی جنگیں دو سو سال چلتی رہی ہیں۔

پہلی صلیبی جنگ ۱۰۹۶ء میں ہوئی، دوسرا حملہ جرمنی کے بادشاہ کورنر ثالث اور فرانس کے لوئی ہفتم نے ۱۱۴۷ء میں کیا۔ تیسری جنگ میں جرمنی اور فرانس کے بادشاہ نے حملہ کیا، ان میں بادشاہ بھی اور شہزادے بھی شریک رہے۔ جنگیں چلتی رہیں، کبھی جرمنی آجاتا کبھی فرانس آجاتا۔ لیکن صلیبی جنگوں کی زیادہ تر قیادت فرانس نے کی، اعلان بھی فرانسیسی پوپ نے کیا تھا۔ دو سو سال انہوں نے جنگی میدان میں مسلمانوں کو مکمل شکست دینے کی کوشش کی اور شکست دیتے بھی رہے۔ بیت المقدس نوے سال ہمارے ہاتھوں سے باہر رہا۔ نوے سال کے بعد صلاح الدین ایوبیؒ نے ان سے بیت المقدس کو آزاد کرایا۔ پھر ایک موقع پر بیت المقدس چند سالوں کے لیے ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تھا،

پھر واپس لیا۔ آخری صلیبی جنگ ۱۲۹۲ء میں ہوئی جس میں صلیبی فیصلہ کن شکست کھا کر ناکام ہو گئے اور پھر واپس نہیں آئے۔ واپس تو آئے ہوئے ہیں لیکن دوسرے راستے سے آئے ہیں۔

میں نے صلیبی جنگوں کا مختصر تعارف یہ کرایا ہے کہ بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی ان جنگوں میں گزری ہیں۔ یہ مذہبی جنگ تھی، صلیب کے نام پر تھی، فلسطین پر قبضے کے لیے تھی، بیت المقدس پر کنٹرول کرنے کے لیے تھی۔ ان دو صدیوں میں نوے سال وہ غالب رہے ہیں، پھر صلاح الدین ایوبیؒ نے، اللہ تعالیٰ اس کے درجات بلند فرمائے، بیت المقدس آزاد کرایا۔ صلیبی جنگیں ۱۲۹۲ء تک چلتی رہیں۔

صلیبی جنگوں کے بعد

صلیبی جنگوں میں ناکامی کے بعد انہوں نے رخ بدلا اور دو راستے اختیار کیے:

۱. ایک محاذ علمی و فکری تھا جسے استشراق کہتے ہیں، اس کی بھی ایک لمبی تاریخ ہے۔ اس سے مراد مشرق کا مطالعہ ہے، یعنی مسلمانوں کے علوم میں مہارت پیدا کر کے ان کے اندر شکوک کی فضا پیدا کرنا۔

۲. اور دوسرا محاذ نوآبادیاتی نظام تھا۔ یورپ میں ایک دور میں یہ شوق پیدا ہو گیا تھا کہ سمندر پار کے ملکوں کو دریافت کرو اور تجارتی تعلقات بنا کر وہاں تجارتی مراکز بناؤ۔

عیسائی ممالک کا نوآبادیاتی دور

نوآبادیاتی دور یہ تھا کہ دوسرے براعظموں کی تلاش کے دوران تجارت کے نئے نئے مراکز تلاش کرنے کے لیے یورپی ملکوں کے نمائندے اور قافلے بحری بیڑے لیے گھومتے پھرتے تھے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے واسکوڈے گاما آیا، امریکہ میں پہلے کولمبس پہنچا۔ یہ بھی ایک مقابلہ تھا اسپین، برطانیہ اور فرانس وغیرہ کے درمیان کہ کون زیادہ تجارتی مراکز دریافت کرتا ہے۔ جہاں جاتے تھے، ان کا بنیادی عنوان تجارت ہوتا تھا۔ ہندوستان کے ساتھ ان کی لمبا عرصہ تجارت رہی ہے،

یہاں سے سامان لے جاتے تھے، وہاں سے سامان یہاں لاتے۔ اس کے لیے باقاعدہ کمپنیاں بنیں۔ ہماری طرف پرتگال، فرانس اور برطانیہ نے رخ کیا۔ ہالینڈ ہمیں کراس کر کے انڈونیشیا چلا گیا۔ یہ تجارت کے نام پر آئے اور تجارتی اڈے قائم کیے۔ ہندوستان میں دو ایسٹ انڈیا کمپنیاں آئی ہیں، ایک فرانس کی اور ایک برطانیہ کی۔ یہاں مغلوں کا دور تھا، ان سے تجارت کی اجازت لی اور تجارت شروع کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اکبر بادشاہ کے دربار میں پیش ہوئے اور تجارت کی اجازت مانگی، اس نے اجازت دے دی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی فرانس کی اور ایسٹ انڈیا کمپنی برطانیہ کی، دونوں کا یہاں آنا جانا شروع ہو گیا، ان کا آپس میں مقابلہ تھا اور ہم سے مراعات حاصل کرنے کا سلسلہ تھا۔

تجارت سے حکمرانی تک کا سفر

یہ لوگ آہستہ آہستہ حکمران کیسے بنے؟ یہ تاجر لوگ تھے، تجارت کے لیے آئے تھے، ٹائٹل بھی تجارت کا تھا۔ انہوں نے مختلف علاقوں میں اپنے تجارتی مرکز قائم کیے، کلکتہ، بمبئی، لکھنؤ، دلّی وغیرہ میں۔ سامان رکھنے کے لیے تجارتی مراکز تو چاہییے تھے۔ جب مرکز مستحکم ہو گئے تو انہوں نے اجازت مانگی کہ ہمیں اپنے تجارتی مراکز کی حفاظت کے لیے مقامی فورس بھرتی کرنے کی اجازت دی جائے۔ مغلوں نے اجازت دے دی۔ اگر بیس پچیس مراکز ہوں اور ہر مرکز کی حفاظت کے نام پر دو دو سو آدمی ہوں تو یہ کافی تعداد بن جاتی ہے۔ اس طریقے سے یہ چھوٹی چھوٹی فوجیں بناتے گئے۔

ادھر مغلوں میں انتشار پھیل گیا۔ حیدر آباد دکن الگ ہو گیا۔ ادھر سکھوں نے بغاوت کر دی۔ ادھر مرہٹوں نے بغاوت کر دی۔ مغل آپس میں لڑ پڑے۔ شاہ جہاں کے بعد اقتدار پر قبضے کے لیے اورنگزیب، داراشکوہ اور شجاع کے درمیان خوفناک جنگیں ہوئیں۔ انگریز اس سے دوہرا فائدہ اٹھاتے تھے۔ پنجاب پر سکھوں نے مغلوں کی کمزوری کی وجہ سے قبضہ کر لیا۔ صرف پنجاب ہی نہیں، موجودہ صوبہ خیبر پختونخوا بھی ان کے اقتدار میں چلا گیا۔ ملتان سے لے کر پشاور تک رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔ ادھر مرہٹے بڑھ رہے تھے جن کے مقابلے کے لیے احمد شاہ ابدالیؒ آیا تھا۔ مغلوں کی خانہ جنگی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طاقت آہستہ آہستہ بڑھتی گئی اور مغلوں کی طاقت گھٹتی گئی۔

۱۷۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا بنگال پر قبضہ

ایسٹ انڈیا کمپنی نے سب سے پہلے بنگال پر قبضہ کیا۔ ۱۷۵۷ء میں چھوٹی چھوٹی فوجیں ملا کر انہوں نے اپنی ایک طاقت بنالی تھی۔ بنگال میں نواب سراج الدولہؒ حکمران تھے۔ انگریزوں نے اس بنا پر قوانین کی خلاف ورزی شروع کر دی تھی کہ ہم طاقتور ہیں، فوج ہمارے پاس ہے، جو معاہدات تجارتی طور پر کر رکھے تھے، ان معاہدات کی خلاف ورزی شروع کر دی، سراج الدولہؒ نے ٹوکنا شروع کیا۔

اس سے پہلے کا ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ مغل حکمران نظر رکھتے تھے اور جہاں خلاف ورزی زیادہ ہوتی وہاں کنٹرول بھی کر لیتے تھے۔ ہمارا ایک بڑا علمی حلقہ ہے فرنگی محلی علماء کا۔ مُلا نظام الدین فرنگی محلیؒ کا اپنے علاقے کے لوگوں سے جھگڑا ہو گیا اور اپنا علاقہ چھوڑنا پڑا۔ لکھنؤ آئے جہاں ایک تجارتی مرکز تھا جو فرنگی محل کہلاتا تھا، فرنگیوں کا محل۔ تجارتی مرکز تھا، اورنگزیب عالمگیرؒ نے اپنے دور میں کسی خلاف ورزی کی وجہ سے یہ محل ان سے ضبط کر لیا تھا اور ان کو وہاں سے نکال دیا تھا۔ یا کہا جاتا ہے کہ اس کا مالک مر گیا تھا اور کوئی اس کا وارث نہیں تھا، تو ان کے قبضہ کرنے کی وجہ سے یا مالک کے مر جانے کی وجہ سے وہ مغلوں کے قبضے میں آ گیا۔ مُلا نظام الدین سہالویؒ جب اپنے علاقے سے لٹ پٹ کر آئے، ان کی شیعوں سے لڑائی ہوئی تھی جنہوں نے علاقے سے نکال دیا تھا۔ اورنگزیب عالمگیرؒ نے وہ لکھنؤ کا فرنگی محل ان کو دے دیا کہ مدرسہ بناؤ۔ وہ فرنگی محل کا مدرسہ ابھی تک چل رہا ہے۔ یہ فقہ اور معقولات کا مرکز تھا۔

جس طرح اورنگزیبؒ نے انگریزوں کا محل ضبط کر لیا تھا اسی طرح سراج الدولہؒ نے ان پر کچھ پابندیاں لگائیں تو بنگال کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے سراج الدولہؒ کے احکامات کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس بغاوت کے نتیجے میں جنگ ہوئی، سراج الدولہؒ کی فوج کو شکست ہوئی، سراج الدولہؒ شہید ہوئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے پورے بنگال پر قبضہ کر لیا۔ اور نواب سراج الدولہؒ کو شکست خود ان کے وزیر اعظم میر جعفر کی غداری کی وجہ سے ہوئی۔ یہ ان کا پہلا اقتدار تھا جو انہوں نے ۱۷۵۷ء میں حاصل کیا۔ بنگال کی شکست کے بعد انگریز کو بیس مل گئی اور وہ آگے بڑھنے لگے، مختلف شہروں میں ان کی کمپنیاں تو پہلے ہی تھیں، تجارتی اڈے اور حفاظت کے لیے فوجیں بھی تھیں۔

انگریز کے ابتدائی دور میں بنگال ایک ہی تھا۔ اس میں کلکتہ بھی تھا، ڈھاکہ بھی تھا۔ اب کلکتہ مغربی

بنگال کا دارالحکومت ہے اور ڈھاکہ مشرقی بنگال کا دارالحکومت ہے۔ جب پاکستان بنا تو مشرقی بنگال ہمارے حصہ میں آیا، مغربی بنگال میں ہندو اکثریت تھی۔

میں نے ان کا طریق کار آپ کو بتایا ہے کہ اس طریقہ سے یہ طاقت پکڑتے پکڑتے بغاوت پر آئے اور سب سے پہلی ریاست انہوں نے بنگال میں قائم کی۔ اس سے ان کے پاؤں وہاں جمے اور پھر آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے تقریباً ستر سال میں دہلی پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ اس طریقے سے یہ آگے بڑھتے گئے اور نوآبادیاتی بناتے گئے۔ ان کا نوآبادیاتی نظام یہ تھا کہ مسلمان ممالک میں تجارت کے نام سے جا کر وہاں اثر و رسوخ بڑھاؤ اور آہستہ آہستہ ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر قبضہ کر لو۔ اس کی میں نے ابتدا بیان کی ہے کہ ہمارے ہاں اس کی ابتدا بنگال سے ہوئی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کو سمجھنے کے لیے آج کی ملٹی نیشنل کمپنیاں دیکھ لیں جو مختلف اقوام کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہیں، کسی ملک میں سرمایہ کاری کرتی ہیں، تجارت پر اجارہ داری حاصل کرتی ہیں، پھر سیاست دانوں کو قابو کرتی ہیں، اور حکومتی نظام کو کنٹرول کرتی ہیں۔ ملٹی نیشنل کمپنی ایسٹ انڈیا کمپنی کا جدید ایڈیشن ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کے نام پر آئی اور اثر و رسوخ حاصل کیا اور پھر یہاں کے حکمرانوں کی کمزوریوں کو دیکھ کر بغاوت کر دی۔

۱۷۹۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا میسور پر قبضہ

ایسٹ انڈیا کمپنی برطانیہ کی دوسری بڑی لڑائی سلطان ٹیپو شہیدؒ سے ہوئی۔ ۱۷۹۹ء میں میسور کی جنگ ہوئی۔ میسور ایک آزاد ریاست تھی، انگریزوں کو قبول نہیں کرتی تھی، اس جنگ میں سلطان ٹیپوؒ شہید ہو گئے اور میسور پر بھی انہوں نے قبضہ کر لیا۔

سلطان ٹیپوؒ کے والد سلطان حیدر علیؒ نے سلطنتِ خداداد میسور قائم کی تھی۔ یہ جنوبی ہند میں ہے، وہاں اکثریت ہندوؤں کی تھی، تب بھی اور اب بھی۔ حیدر علی کے بعد ٹیپو سلطانؒ آیا، یہ بڑا مجاہد آدمی تھا۔ حیدر علیؒ بھی ایک غیور مسلمان تھا۔ سلطان ٹیپوؒ نے اس عزم کا اظہار کیا کہ میں انگریزوں کا راستہ روکوں گا۔ اس زمانے میں ماحول کیا تھا اور سلطان ٹیپوؒ کے عزائم کیا تھے؟ اس پر میں کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔

سائنس وٹیکنالوجی: خلافتِ عثمانیہ اور سلطنتِ مغلیہ کی کوتاہ اندیشی

ماحول یہ تھا کہ اُدھر ترکی میں خلافتِ عثمانیہ قائم تھی، اِدھر ہند میں مغل حکومت قائم تھی، لیکن ہمارے پاس کہیں بھی اسلحہ سازی کے کارخانے نہیں تھے۔ میں یہ بات عرض کیا کرتا ہوں کہ ہماری دو بڑی سلطنتیں جو اپنے وقت میں عظیم سلطنتیں تھیں لیکن دونوں نے، خلافتِ عثمانیہ نے بھی اور مغل حکومت نے بھی، سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی، جس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں اور خدا جانے کب تک بھگتتے رہیں گے۔

جبکہ اندلس کی مسلمان حکومت نے سائنس، ٹیکنالوجی اور جغرافیہ پر صرف توجہ ہی نہیں دی بلکہ اس کی بنیاد ہی اندلس کی مسلم حکومتوں نے قائم کی۔ ہمارے ہاں عباسی دور میں ہی یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا، مامون کے دور میں کہ فلسفہ، سائنس اور حکمت کا دور شروع ہو گیا تھا۔ جبکہ بنوامیہ نے اندلس میں بیٹھ کر نہ صرف خود بلکہ یورپ کو بھی راستہ دکھایا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سائنس ٹیکنالوجی کی بنیاد اندلس کی مسلمان حکومتوں نے رکھی لیکن بدقسمتی کہ جب ہم بنیاد رکھنے کے بعد تعمیر کی پوزیشن میں آئے تو شکست کھا گئے تھے، اندلس ہمارے ہاتھ سے چھن گیا تھا۔ ہماری بنیادوں پر یورپ نے سائنسی ترقی کی بنیاد رکھی اور آج تک سائنس ٹیکنالوجی میں اسی کی اجارہ داری ہے۔ آج سائنس، جغرافیہ میڈیکل سائنس کے پیچھے دیکھیں تو آپ کو کوئی نہ کوئی مسلمان سائنسدان محنت کرتا ہوا دکھائی دے گا۔ یہ اندلس کی مسلمان حکومتوں کی توجہ تھی جس کے نتیجے میں صرف یورپ کو نہیں دنیا بھر کو سائنس اور ٹیکنالوجی ملی ہے۔

لیکن خلافتِ عثمانیہ اور مغل حکومت کا سائنس اور ٹیکنالوجی میں کوئی کردار نہیں ہے، جبکہ اپنے دور کی یہ بڑی عالمی حکومتیں تھیں۔ تقریبًا پانچ صدیاں دنیا میں ان کی طاقت کا لوہا مانا جاتا رہا ہے، لیکن انہوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف توجہ نہیں دی جس کا خمیازہ ہمیں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اس کی ایک ہلکی سی مثال دیتا ہوں۔ تیل کو دریافت ہوئے سو، سوا سو سال گزرے ہیں، اس زمانے میں سب سے پہلے عراق میں تیل کے چشموں کا سراغ لگا تھا۔ یہ سلطان عبدالحمید ثانیؒ کا زمانہ تھا۔ اب سے ۱۱۰ سال پہلے اس کا دور بیسویں صدی کا پہلا عشرہ تھا۔ سلطان موصوفؒ نے خود اپنی یادداشتوں میں بیان کیا ہے کہ ہم کہاں کھڑے تھے اور ہمارے ساتھ کیا ہوا۔ اس زمانے میں ہماری جرمنی کے ساتھ صلح

تھی، عالمی محاذ پر جرمنی اور خلافتِ عثمانیہ اکٹھے تھے۔ پہلی جنگ عظیم ان دونوں نے مل کر مغربی یورپ سے لڑی، جس میں دونوں کو شکست ہوئی، اس کے بعد جرمنی نے خود کو سنبھال لیا جبکہ ہمارا بیڑا غرق ہو گیا۔

عراق میں جرمنی کی تیل نکالنے والی کمپنیاں

سلطان عبد الحمید ثانیؒ اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں مجھے اپنے اداروں کی طرف سے رپورٹ ملی کہ عراق کی زمین کے نیچے تیل ہے لیکن ہمارے پاس تو تیل نکالنے کی صلاحیت نہیں تھی۔

تیل نکالنا، پھر اسے ریفائن کر کے قابلِ استعمال بنانا، اور پھر مارکیٹنگ ایک مستقل مسئلہ ہے۔ تیل نکلنا عراق سے ہے اور ضرورت ماسکو کو ہے، تو وہاں تک تیل پہنچانا کس کی ذمہ داری ہے؟ یہ تین مستقل کام تھے تیل نکالنا، اسے ریفائن کرنا اور مارکیٹنگ۔ جبکہ ہم میں ان تینوں کاموں کی کوئی صلاحیت نہیں تھی، اور اب بھی یہ صلاحیت ہمارے پاس نہیں ہے۔ اب بھی ہم نے پاکستان میں تیل نکالنا ہوتا ہے تو چائنہ کو بلاتے ہیں، وہ نہ معلوم زمین کا تیل نکالتا ہے یا ہمارا تیل نکالتا ہے۔

جرمنی کی حکومت خلافتِ عثمانیہ کی دوست حکومت تھی، جیسے اب امریکہ ہمارا دوست سمجھا جاتا ہے۔ جرمنی والوں نے خلافتِ عثمانیہ سے کہا کہ وہاں پینے کا اچھا پانی ہے، ہمیں کنویں کھودنے کی اجازت دیں تاکہ لوگوں کو پینے کا اچھا پانی ملے۔ سلطان عبد الحمیدؒ نے اجازت دے دی، مختلف جرمن کمپنیاں آئیں اور وہاں کنویں کھودنے شروع کر دیے۔ کچھ عرصہ بعد سلطانؒ کو اطلاع ملی کہ وہ وہاں سے پانی بھر بھر کے باہر لے جاتے ہیں۔ ان کو پانی باہر لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ تحقیق پر پتا چلا وہ پانی نہیں تیل ہے جو وہ وہاں سے بھر بھر کے خفیہ طور پر لے جاتے ہیں۔ اس پر سلطانؒ نے کمپنیوں کے وہ ٹھیکے منسوخ کروا دیے بلکہ کنویں ہی بند کروا دیے، کنویں اس لیے بند کروا دیے کہ ہمیں نکالنے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔

اس زمانے میں امریکہ نیا نیا ظاہر ہوا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم میں امریکہ فریق نہیں تھا، دوسری جنگ عظیم میں آیا اور اس کا پہلا دھماکہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرا۔ امریکہ نے عالمی جنگ میں شرکت دو ایٹم بموں کے ذریعے کی ہے، اس سے پہلے امریکہ ایک نیا ترقی یافتہ ملک تھا۔ سلطانؒ کہتے ہیں پھر ہم نے تیل نکالنے کے لیے امریکی کمپنیوں کو بلایا۔ اتنے میں سلطان عبد الحمیدؒ نظر بند ہو گئے اور اسی میں ان کا

انتقال ہو گیا۔

اس کے بعد یورپ کی کمپنیاں آئیں تب سے وہ وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ پہلے کمپنیاں آئیں، پھر ان کی حفاظت کے لیے عسکری دستے بنے، جیسے یہاں بنے تھے، پھر فوجیں آئیں، پھر بینک آئے۔ اب وہاں فوجیں بیٹھی ہوئی ہیں اور وہ بیٹھے ہمارا تیل نکال رہے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم سائنس وٹیکنالوجی میں بہت پیچھے تھے، اس لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کے معاملہ میں ہم ان کے ہاتھوں بے بس ہو گئے۔ اوتومان ایمپائر (سلطنتِ عثمانیہ) کا حال بھی یہی تھا اور مغل ایمپائر کا حال بھی یہی تھا۔ دیکھیں اللہ تعالیٰ افراد کی غلطیاں معاف کر دیا کرتے ہیں لیکن قوموں کی غلطیاں کبھی معاف نہیں کرتے، قوموں کو اپنی غلطیاں بھگتنا پڑتی ہیں، جو ہم بھگت رہے ہیں۔ اقبالؒ نے یہی بات اس طرح کہی ہے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

ٹیپو سلطانؒ کی خلافتِ عثمانیہ سے درخواست

سلطان ٹیپوؒ کو اس کا احساس تھا۔ اس وقت خلافتِ عثمانیہ میں سلطان سلیم اول کا دور تھا، یہ بڑے باجبروت حکمران تھے۔ سلطان ٹیپوؒ نے سلطان سلیم اولؒ کے پاس وفد بھیجا کہ میں آپ کا ایک خادم ہوں، میسور کے علاقے میں میری ریاست ہے، اگر مجھے اپنی سرپرستی میں قبول فرمالیں تو میں آپ کا نمائندہ بن کر حکومت کروں۔ اس زمانے میں یہ ہوتا تھا کہ درخواست کرتے تھے اور کچھ ٹیکس وغیرہ دیتے تھے تو بادشاہ خلعت عطا فرماتے تھے۔ سلطنتِ عثمانیہ کے ساتھ دنیا بھر کے مسلمانوں کی عقیدت تو تھی کہ ہمارا مذہبی وروحانی اور سیاسی مرکز ہے:

۱. اس پر ایک درخواست سلطان سلیمؒ سے کی کہ ایک کام آپ کریں کہ میں اپنی سلطنت میں اسلحہ سازی کے کارخانے بنانا چاہتا ہوں تاکہ ہم مقابلہ کر سکیں۔ خرچ سارا میرا ہو گا، آپ سائنسدان فراہم کریں اور سرپرستی فرمائیں۔
۲. دوسری درخواست سلطان ٹیپو نے سلطان سلیمؒ سے یہ کی کہ عدن جو کہ یمن کا بڑا شہر اور مشہور بندرگاہ ہے، یہ خلافتِ عثمانیہ کے پاس تھی، عدن کا جغرافیائی محلِ وقوع ایسا زبردست

ہے کہ جو عدن پہ بیٹھا ہو وہ ناکے پر بیٹھا ہے، گویا اس نے پورے علاقے میں ناکہ لگا رکھا ہے، اس کی مرضی کے بغیر کوئی نہیں گزر سکتا۔ اب تو ہوائی جہاز ہیں، اس زمانے میں بندر گاہ ہی ہوتی تھی۔ سلطان ٹیپوؒ نے یہ درخواست کی کہ آپ عدن کی بندر گاہ مجھے لیز پر، ٹھیکے پر دے دیں، میں انگریزوں کا راستہ روک لوں گا۔ انگریز ہمارے ملک پر قبضہ کرتے جا رہے ہیں، بنگال پر کر لیا ہے، اب ہماری طرف بڑھ رہے ہیں، میں ان کا راستہ روکوں گا۔

خلیفہ عثمانی سلطان سلیم اولؒ نے خلعت تو عطا فرما دی کہ آپ ہمارے نمائندے ہیں، ہم آپ کے سرپرست ہیں، لیکن یہ بات ماننے سے انکار کر دیا کہ نہ سائنسدان مہیا کیے نہ عدن کی بندر گاہ دی۔ یہ سلطان ٹیپوؒ کی سوچ بتا رہا ہوں کہ اس ماحول میں اس آدمی کا عزم اور سوچ کیا تھی۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکا، پھر جنگ ہوئی جس میں سلطان ٹیپوؒ کو شکست ہوئی، اس کے وزیر اعظم میر قاسم کی غداری کی وجہ سے۔ میسور پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ یہ دوسری بڑی پیشرفت تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کو حاصل ہوئی۔

یہاں ایک طرف کشمکش ایسٹ انڈیا کمپنی فرانس اور ایسٹ انڈیا کمپنی برطانیہ کی ہمارے ساتھ تھی، اور ایک کشمکش دونوں کی آپس میں بھی تھی۔ دونوں علاقے قبضہ کرنے آئے تھے، جہاں موقع ملتا ہمارے ساتھ بھی مل جاتے تھے۔ چنانچہ سلطان ٹیپوؒ کے ساتھ جو جنگ ایسٹ انڈیا کمپنی برطانیہ کی ہوئی، اس میں ایسٹ انڈیا کمپنی فرانس سلطان ٹیپوؒ کے ساتھ تھی۔ اور سلطان ٹیپو کی فوجوں کا کمانڈر فرانسیسی تھا۔ جبکہ حیدر آباد دکن جو ہماری بڑی ریاست تھی ان کو ایسٹ انڈیا کمپنی برطانیہ کا تعاون حاصل تھا، یہ سلطان ٹیپوؒ کے خلاف تھی۔ میسور جب فتح ہو گیا تو اس کے بعد یہ آگے بڑھے اور بڑھتے گئے۔

۱۸۲۲ء میں شاہ عالم ثانی کی شکست

پھر ان کا تیسرا بڑا معرکہ بکسر کا ہوا، لکھنؤ کے علاقہ روہیل کھنڈ کے علاقہ میں حافظ رحمت خان روہیلہ قبائل وغیرہ کے کچھ خاندان سامنے کھڑے ہو گئے، کچھ ریاستیں کھڑی ہو گئیں۔ اس زمانے میں دہلی پر حکمران تھے شاہ عالم ثانی۔ پالم، دہلی کا بین الاقوامی ایئر پورٹ ہے، دہلی شہر سے دس پندرہ میل ہو گا۔ پالم اس وقت ایک الگ بستی تھی۔ شاہ عالم ثانی کو انہوں نے محدود کر دیا کہ آپ کا دائرہ اختیار دہلی سے پالم تک ہے۔ باقی سارا انتظام ایسٹ انڈیا کمپنی نے سنبھال لیا تھا، ایک محاورہ مشہور تھا ''سلطنتِ شاہ عالم، از دہلی تا پالم''۔

تیسری جنگ ۱۸۲۲ء کے لگ بھگ شاہ عالم ثانی کے ساتھ ہوئی، یہاں بھی انگریزوں کو فتح ہوئی اور شاہ عالم ثانی نے ان کے ساتھ صلح کی۔ صلح میں ان کا آپس میں معاہدہ تھا کہ نام بادشاہ کا ہی رہے گا، حکومت بادشاہ کے نام سے چلے گی، لیکن عملاً حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہوگی۔ انتظامی، عدالتی اور مالیاتی اختیارات و کنٹرول ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہوگا، جبکہ مُہر بادشاہ کی ہوگی۔ ان کا یہ معاہدہ ریکارڈ پر موجود ہے۔ اعلان تین جملوں کا تھا: ''زمین خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا''۔

کمپنی سے مراد ایسٹ انڈیا کمپنی کہ نظام وہ چلائے گی۔ ان کا نمائندہ دہلی آکر بیٹھ گیا، اس نے سارا نظام سنبھال لیا۔ آخری مُہر بادشاہ کی لگتی تھی، بادشاہ کا شوق پورا کرنے کے لیے دہلی سے پالم تک کا علاقہ دے دیا گیا کہ یہاں آپ جو مرضی کریں، باقی پورے انڈیا میں کنٹرول ہمارا ہوگا۔

اس اعلان پر حضرت شاہ عبد العزیزؒ نے، جو اس وقت علماء کے سرخیل تھے، ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا مشہور فتویٰ دیا جو ''فتاویٰ عزیزی'' میں موجود ہے۔ اس فتویٰ کی بنیاد دو چیزوں پر تھی:

۱. نصاریٰ کا تغلب ہوگیا ہے یعنی کنٹرول ان کے ہاتھ میں چلا گیا ہے،
۲. اور شرعی قوانین کی جگہ نئے انگریزی قوانین آگئے ہیں۔

اس لیے اب یہ ملک دارالاسلام نہیں رہا، دارالحرب ہوگیا ہے اور آزادی کے لیے جہاد فرض ہوگیا ہے۔ یہ ایک تاریخی بحث ہے کہ ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ سب سے پہلے کس نے دیا تھا۔ ہمارے ہاں اب تک معروف ہے کہ سب سے پہلے یہ فتویٰ شاہ عبد العزیزؒ نے دیا تھا لیکن تاریخی بحث یہ بھی ہے کہ ایک فتویٰ اسی عنوان کا اور اس سے زیادہ تفصیلی حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کا موجود ہے۔ یہ شاہ عبد العزیزؒ کے معاصر اور شاہ ولی اللہؒ کے شاگرد ہیں۔ میں نے قاضی صاحبؒ کا وہ قلمی فتویٰ کاندھلہ میں دیکھا ہے جب ہم دو سال پہلے دیوبند شیخ الہندؒ سیمینار میں گئے تھے، میں اور مولانا اللہ وسایا، مولانا نور الحسن راشد کے ہاں گئے تھے۔ مولانا نور الحسن راشد نے اس پر ریسرچ کی ہے، انہوں نے بتایا کہ قاضی صاحبؒ کا فتویٰ مقدم ہے۔ اب تو انہوں نے اس کو نیٹ پر بھی جاری کر دیا ہے۔ بہرحال جس کا فتویٰ بھی مقدم ہو، ہمارے لیے دونوں قابلِ احترام ہیں۔

مسلم ریاست کی غیر موجودگی میں جہاد کا فتویٰ

ابھی ایک نئی بحث چلی ہے۔ ''پیغامِ پاکستان'' ایک قومی بیانیہ ہے، میں اس کے لیے ایوانِ صدر میں ہونے والی تقریب میں شریک تھا۔ میں اس کی ایک شق پر بحث کرنا چاہوں گا کہ جہاد کا اعلان صرف ریاست کا حق ہے، کسی فرد یا گروہ کا حق نہیں ہے۔ میں نے اپنے کالم میں ایک سوال اٹھایا کہ اگر آپ پہلے مجھے اس کی تشکیل میں شریک کرتے تو میں ایک تجویز دیتا، کیونکہ جو فتویٰ اجتماعی ہوتا ہے اس میں مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا چاہیے۔ شخصی فتویٰ کسی ایک جز کے بارے میں دیا جاسکتا ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ ایک مسلّمہ مسلم ریاست کے ہوتے ہوئے جہاد کا اعلان ریاست ہی کا حق ہے، فرد یا گروہ کو نہیں ہے۔ لیکن اگر خود ریاست ختم ہو جائے تو پھر کون اعلان کرے گا؟ اگر غیر ملکی تسلط، غیر مسلم اقتدار ریاست ہی کو ہیک کر لے، ریاست کا انتظامی ڈھانچہ ختم ہو جائے، دوسروں کے قبضے میں چلا جائے، تب اس اعلان کی اتھارٹی کس کے پاس ہوگی؟ کیا اس صورتحال کو ہم قبول کر لیں گے، یا کوئی کھڑا ہوگا اور مزاحمت کا اعلان کرے گا؟

اس کی مثال میں نے یہ دی کہ جب ۱۸۲۲ء میں شاہ عالم ثانی کے دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی کا اقتدار اپنے کنٹرول میں لے لیا اور اعلان کر دیا کہ اب نظم و نسق اور عدالت و مالیات ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں ہوں گے، اور شاہ عالم ثانی کی صرف مُہر چلے گی، تو شاہ عبد العزیزؒ نے فتویٰ دیا تھا۔ اب خدانخواستہ ایسی کوئی پوزیشن دوبارہ پیدا ہو جائے اور یہ غیر متوقع نہیں ہے، ہمارے اردگرد ہمارے سروں پر سینکڑوں ملٹی نیشنل کمپنیاں ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کی شکل میں ایسے منڈلا رہی ہیں جیسے گدھ منڈلا رہے ہوتے ہیں کہ کوئی جانور مرنے کے قریب ہو اور اسے جا کر دبوچ لیں۔

اس کی میں ایک اور فقہی مثال دیتا ہوں۔ احناف کے ہاں جمعہ کے انعقاد کی شرائط میں ہے کہ ''سلطان اونائبہ'' امیر المؤمنین یا اس کا نمائندہ جمعہ پڑھائے گا۔ ہمارے ہاں جب تک مغل حکومت تھی اس کے حکمران یا نمائندے جمعہ کی امامت کرتے رہے، لیکن جب ہمارا سلطان ختم ہو گیا تو پھر جمعہ کا پڑھنا جائز ہے یا ناجائز ہے؟ شرائط تو نہیں پائی جاتیں۔ فقہاء احناف کے ہاں کافی عرصہ یہ بحث رہی کہ اب جمعہ ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ تو ہم جمعہ کو تعطل سے بچانے کے لیے ''سلطان اونائبہ'' کا متبادل لائے کہ مسجد کے نمازی جس پر متفق ہو جائیں، جس کو امام بنا لیں۔ یہ اصل نہیں ہے، متبادل

ہے۔ اس پر بھی ابھی بحث جاری ہے، ہمارے بہت سے فقہاء جو اس متبادل پر مطمئن نہیں تھے، ان کے ہاں اس طرح جمعہ پڑھنے کے ساتھ احتیاطی ظہر بھی پڑھنے کا کہا جاتا ہے۔ اور اس میں مولانا احمد رضا خانؒ تو بہت سخت تھے کہ جمعہ کے ساتھ ظہر بھی پڑھو۔ ظہر احتیاطی کے پیچھے یہی فلسفہ ہے کہ شرط موجود نہیں ہے، جمعہ کیسے ہوگا۔

درمیان میں ایک لطیفہ کی بات کہ میں نے ایک دفعہ علماء کرام کی ایک محفل میں تفنن طبع کے طور پر کہا کہ آپ اسلامی نظام اور اسلامی ریاست اور خلافت کے قیام کے حق میں ہیں۔ انہوں نے کہا، بالکل حق میں ہیں۔ میں نے کہا اگر آج صحیح معنوں میں اسلامی ریاست قائم ہو جائے، خلافت قائم ہو جائے تو آپ کے جمعے خلیفہ کی اجازت پر موقوف ہوں گے یا ویسے ہی جائز ہو جائیں گے؟ خلیفہ کا نائب ہی جمعہ پڑھائے گا۔ سب سے پہلے تو آپ کو منبر چھوڑنا پڑے گا۔ اور پھر زکوٰۃ بیت المال وصول کرے گا یا مدرسے وصول کریں گے؟ منبر بھی گیا، مدرسہ بھی گیا۔ میں نے کہا اب اسلامی نظام کے قیام کا نعرہ لگاؤ۔ یہ میں نے تفنن طبع کے طور پر کہا تھا لیکن یہ امرِ واقع ہے۔

میں نے یہ مثال اس لیے دی ہے کہ جس طرح جمعے کو تعطل سے بچانے کے لیے ہم نے اس شرط کا متبادل اختیار کیا، میرا سوال مفتیان کرام سے یہ ہے کہ اگر ریاست کا انتظامی ڈھانچہ ہی ختم ہو جائے اور دشمن کا قبضہ ہو جائے تو جہاد کا اعلان کون کرے گا؟ اس صورتحال کو قبول کر لینا اسلام کا تقاضا ہوگا یا کوئی مجاز اتھارٹی ہوگی جو مزاحمت کا اعلان کرے گی؟ مجھے ''پیغامِ پاکستان'' سے پورا اتفاق ہے لیکن یہ ایک پہلو تشنہ رہ گیا ہے، اس پر بھی جواب آنا چاہیے۔ ظاہر بات ہے اگر جمعے میں علماء متبادل ہیں تو یہاں بھی علماء ہی متبادل ہوں گے۔ جب شاہ عبد العزیزؒ نے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا تو یہ فتویٰ ہی پوری جنگ آزادی کی بنیاد بنا ہے۔ اس فتوے کے بعد جو پہلا معرکہ انگریزوں اور سکھوں کے ساتھ اس فتوے کی بنیاد پر ہوا وہ شہداء بالاکوٹ کا ہوا۔

ہندو مت

تعارف اور تاریخی پس منظر

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ حضرات علماء کرام! آج اس حوالے سے کچھ بات ہوگی کہ ہندو مذہب کیا ہے، اس کے ساتھ ہمارے معاملات کیا چلے آرہے ہیں، اور اس وقت ہم کس پوزیشن میں ہیں؟

ہندو مذہب کا آغاز کب ہوا، اس کی بنیادیں کیا ہیں، اور ان کے بنیادی عقائد کیا ہیں؟ اس بارے میں تاریخ خاموش ہے۔ ہندو مذہب کی بنیاد اور بنیادی عقائد کے بارے میں کوئی متفقہ بات نہیں ملتی۔ عام طور پر اسے وطنی مذہب سمجھا جاتا ہے۔ ایک زمانے میں متحدہ ہندوستان میں رہنے والے لوگ ہندی اور ان کا مذہب ہندو مذہب کہلاتا تھا۔ بعض مذاہب نسلی ہیں جیسے یہودیت، اس طرح ہندومت وطنی مذہب ہے کہ ہندوستان کے اندر رہنے والے ہندو ہیں۔

ویدوں کی حقیقت

ویدوں کا زمانہ عام طور پر اس کی ابتدا کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ اسے ویدک عہد کہتے ہیں۔ ویدوں کو الہامی کتابیں سمجھا جاتا ہے، جو کہ چار ہیں۔

مولانا شمس نوید عثمانیؒ انڈیا کے بڑے عالم تھے۔ موجودہ دور کے علماء میں مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی، جو مولانا منظور احمد نعمانیؒ کے بیٹے ہیں، اس محاذ پر سرگرم ہیں اور ویدوں کے بھی عالم ہیں۔ اور مولانا کلیم صدیقی کی بھی ہندوؤں میں اسلام کی تبلیغ اور دعوت کے حوالے سے بڑی خدمات ہیں، وہ بھی ویدوں کے عالم ہیں۔ مولانا شمس نوید عثمانیؒ اور دوسرے حضرات کی رائے یہ ہے کہ اصلاً ویدیں کسی پرانے مذہب کی الہامی کتابیں لگتی ہیں۔

مولانا شمس نویدؒ نے "اگر اب بھی نہ جاگے تو" نامی کتاب میں ویدوں کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ وہ اسے حضرت نوح علیہ السلام کے باقی ماندہ افراد کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ویدوں کا لہجہ، تعلیمات اور اسلوب آسمانی کتابوں جیسا ہے۔ ان میں توحید، وضو، نماز، اللہ کی عبادت اور روزہ وغیرہ کا ذکر ہے۔ اور ویدوں کا زمانہ بھی کم و بیش ایک ہزار سال قبل مسیح کا ہے۔ اس ویدک عہد سے پہلے ان کا تذکرہ

نہیں ملتا۔

داخلی مذاہب

اس کے بعد ہندو مذہب ہندوستان کے وطنی دائرے میں ہے لیکن ان کے عقائد آپس میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ جنوبی ہند کے اور ہیں، شمالی ہند کے اور ہیں، وسطی ہند کے اور ہیں۔ محاورہ بھی ہے کہ ''گنگا گئے تو گنگارام، جمنا گئے تو جمناداس''۔ رام اور داس دو مختلف مذاہب کی علامتیں ہیں، جو اُن کے اندرونی مذاہب ہیں۔ ان کی پرانی تعلیمات کی اصطلاحات میں تنتر (ہدایت) اور پران (مذہبی نظمیں) ملتی ہیں۔ جیسے بائبل میں زبور شاعری کی زبان میں ہے۔ اور ہمارے ہاں بھی شاعری صحابہ کرامؓ کے زمانے سے چلی آرہی ہے۔ ان کی کتابوں میں بھگوت، گیتا، دیوتا اور دیوی ہیں۔

دیانند سرسوتی کی ''ستیار تھ پرکاش''

ان کے بڑے پنڈت گزرے ہیں آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی، جو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے معاصر تھے۔ ان کا آپس میں مکالمہ و مناظرہ بھی ہوا، تحریری مکالمہ بھی ہوا اور گفتگو بھی ہوئی۔ انہوں نے کتاب لکھی ''ستیار تھ پرکاش''۔ ہندو مذہب کو منظم رنگ میں پیش کیا، جیسے ہمارے ہاں حدیث کی کتاب ہوتی ہے، عقائد کا باب، عبادات کا باب، اخلاقیات کا باب، معاملات کا باب وغیرہ۔ اسی طرح اس کتاب میں ہندو نظام، ان کے خاندانی معاملات، نکاح، طلاق، تجارت، اور سیاست کو بیان کیا ہے۔ اس کے آخر میں چودھویں باب میں قرآن کریم اور اسلام پر ایک سو سے زیادہ اعتراضات کیے ہیں۔ اگر ہندو مذہب کا منظم اور ترقی یافتہ شکل میں مطالعہ کرنا ہو تو ''ستیار تھ پرکاش'' کا مطالعہ کریں۔

اس میں پنڈت دیانند سرسوتی نے ہم پر ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ آپ ہم پر اعتراض کرتے ہو کہ ہم پتھر کی پوجا کرتے ہیں، مسلمان بھی تو پتھر ہی کی پوجا کرتے ہیں۔ ہم پتھر کی مورتی بنا کر اس کو پوجتے ہیں اور تم نے پتھر کا مکان بنا رکھا ہے خانہ کعبہ، اس کو پوجتے ہو۔ ہم مورتی کے گرد چکر کاٹتے ہیں تم مکان کے گرد چکر کاٹتے ہو۔ یہ بھی پتھر کا بنا ہوا ہے وہ بھی پتھر کا بنا ہوا ہے۔ اس کے جواب میں مختلف علماء نے لکھا ہے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا رسالہ ہے ''قبلہ نما'' اس میں انہوں نے

اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔

عقائد ورسومات

ہندو مذہب میں طرح طرح کے عقائد اور رسومات ہیں جن کا کوئی طے شدہ دائرہ نہیں ہے۔

حلول کا عقیدہ

جس انسان کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ اس میں رام کی ذات حلول کر گئی ہے اور اس میں دیوتا کی صفت آگئی ہے، اسے مرد ہو تو "دیوتا" اور عورت ہو تو "دیوی" کہتے ہیں۔ برہمن، شیوا جی اور وشنو مہاراج دیوتا ہیں، جبکہ مایہ اور لکشمی وغیرہ دیویاں ہیں۔ ان کا تصور حلول کا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان میں حلول کر کے اپنی زیارت کرواتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی حلولی گروہ چلا آ رہا ہے، ہمارے بعض صوفیاء کے ہاں اس طرح کا تصور پایا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ یہ کہ ہمارے قریب کے زمانے کے ایک بڑے بزرگ گزرے ہیں حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، انہوں نے خود اپنا قصہ سنایا کہ ایک زمانے میں سندھ کے علاقے میں ایک گاؤں میں گئے تو گاؤں کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ کسی نے ان کو بتا دیا کہ اللہ پاک ایک بزرگ کی شکل میں آئے ہیں۔ لوگ آ کر کہنے لگے، آپ ہمارا یہ کام کر دیں۔ حضرت نے کہا کہ اللہ کے بندو میں تو انسان ہوں اور میرا نام عبد اللہ (اللہ کا بندہ) ہے۔ وہ کہتے، نہیں آپ اللہ ہیں انسانی شکل میں آئے ہیں۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کبھی شکلیں بدل کر دنیا میں گھومتے ہیں۔

آج اس جدید دور میں بھی یہ تصور پایا جاتا ہے۔ امریکہ میں "نیشن آف اسلام" کے نام سے جو مذہب ہے سیاہ فاموں میں، آلیجا محمد نے ۱۹۳۴ء میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ اس سے پہلے ماسٹر فارد محمد نے ۱۹۳۰ء میں اپنی تبلیغ کا آغاز کیا اور ایک مرکز بنایا۔ چار سال کے بعد وہ غائب ہو گئے اور آلیجا محمد اس کا جانشین بنا جس نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ ان کے باضابطہ عقائد میں یہ بات شامل ہے کہ ماسٹر فارد محمد اصل میں اللہ تھے، چار سال ہماری اصلاح کرتے رہے، پھر آلیجا محمد کو اپنا جانشین بنا کر آسمانوں پر واپس چلے

گئے۔ یہ تصور ہر زمانے میں کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا رہا ہے۔

ہندوؤں کے ہاں بھی اوتار اور بھگوان کا تصور پایا جاتا ہے، ان کے ہاں مذہبی پیشوا کو پروہت کہا جاتا ہے۔ پروہت، پنڈت اور برہمن ان کی مذہبی پیشوائی کرتے ہیں۔ یہ مظاہر کے پجاری ہیں، ان کے کروڑوں دیوتا ہیں۔ ان کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت کسی بھی چیز میں دکھائی دے تو وہ خدا کی صفت کا مظہر ہے۔ کسی بھی چیز میں کوئی امتیازی صفت دیکھتے ہیں تو ان کا تصور یہ ہے کہ اس کے ذریعے جو خدا کی صفت کا اظہار ہے وہ ہمارا معبود ہے۔ ہم انہیں بت پرست کہتے ہیں کہ پتھر کی مورتی بنا کر اس کی پوجا کرتے ہیں۔

گائے کا تقدس

بہرحال مظاہرِ فطرت کی پوجا ان کا بنیادی مذہب ہے۔ ان مظاہرِ فطرت میں ان کے ہاں گائے سب سے مقدس چیز ہے، اسے گاؤ ماتا کہتے ہیں اور گائے کی توہین برداشت نہیں کرتے۔ گائے جہاں سے چاہے کھائے پیئے، اسے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ حضرت صالحؑ کی اونٹنی کی خصوصیات ''ولا تمسوھا بسوء'' (ھود ٦٤) وغیرہ کو گائے پر فٹ کیا ہوا ہے کہ یہ اللہ میاں کی گائے ہے، کوئی اسے تنگ نہیں کرے گا۔ گائے کی توہین کو بہت بڑا جرم سمجھتے ہیں۔ ہمارے بہت سے شہروں میں گاؤشالا کے نام سے آپ کو پرانی عمارتیں ملیں گی۔ گوجرانوالہ میں بھی ایک گاؤشالا تھا۔ یہ گائے کی حفاظت کے لیے ایک مستقل مرکز ہوتا تھا۔ ایک بڑی حویلی ہوتی تھی جہاں گائے کی حفاظت، خدمت اور دیکھ بھال کی جاتی۔ انڈیا میں اب بھی گاؤشالا عمارتیں ہیں۔

گائے کے نام پر وہاں فسادات بھی ہوتے ہیں۔ ویسے تو ان کے ہاں کسی بھی جانور کو ذبح کرنا درست نہیں ہے، لیکن گائے کو ذبح کرنا ان کے نزدیک بہت بڑا جرم ہے۔ صرف حرام نہیں بلکہ توہین ہے، اس پر کٹ مرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ اور دلچسپی کی بات یہ ہے کہ گائے کا پیشاب ان کے ہاں بڑی مقدس چیز ہے۔ گائے مُوت ان کے ہاں واقعتاً اسی طرح ہے کہ اس کو وہ تقدس حاصل ہے جیسے ہمارے ہاں زمزم کو حاصل ہے۔ وہ اسے پیتے ہیں، جسم پر ملتے ہیں، جگہ عبادت کے لیے مخصوص کرنی ہو تو اس جگہ کو گائے کے گوبر اور پیشاب سے لیپ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب یہ پاک ہو گئی

ہے۔

اس پر کچھ عرصہ پہلے لندن میں ایک بحث چلی، وہاں کے اخبارات میں رپورٹ چھپی، میں نے بھی ماہنامہ الشریعہ میں نقل کی، وہ یہ کہ گائے کے پیشاب میں کیمیکلز ملا کر پیک کر کے کوکا کولا کی طرز پر کاؤکولا شروع کیا، جو انڈیا میں بکتا بھی ہے اور اسے بڑے تبرک کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ایک اخبار نے گائے کے پیشاب کے طبی اور روحانی فوائد پر مضمون چھاپا۔ ایک مذاکرے میں بحث ہو رہی تھی کہ کیا پاکستان میں اس کی مارکیٹنگ کی گنجائش ہے۔ یہاں سے لطیفہ کی بات شروع ہوتی ہے، میں نے جواب دیا کہ مارکیٹنگ کی تو گنجائش نہیں ہے لیکن سپلائی کی گنجائش پیدا کر لیں گے، گائے کا پیشاب جتنا کہو مہیا کریں گے۔ اس نے پوچھا، مولوی صاحب! یہ جائز ہے؟ میں نے کہا حضرت امام شافعیؒ کا موقف ہے ''بول ما یؤکل لحمہ طاہر'' بلکہ یہ ہمارے امام محمدؒ کا قول بھی ہے۔ یہ میں نے دل لگی کی بات کی، فتویٰ کی بات نہیں کر رہا۔

بہرحال ان کے ہاں گائے کے پیشاب کو تقدس حاصل ہے۔ اس دور میں ان باتوں پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا لیکن یقین کرنا پڑتا ہے۔ پیشاب سے بڑھ کر پنج گیّا (گائے کی پانچ چیزیں) بھی ہندو استعمال کرتے ہیں۔ اس میں گائے کا (۱) پیشاب (۲) گوبر (۳) خون (۴) تھوک (۵) اور ناک کی رطوبت، یہ پانچ چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ ان کو ملا کر معجون سی بناتے ہیں اور کسی کو ہندو بنانے کے لیے یہ چٹاتے ہیں۔ بچے کو اسی کی گھٹی دیتے ہیں اور یہ بڑی برکت کی چیز سمجھی جاتی ہے۔ یہ ان کے مذہب کی بڑی بڑی علامتیں ہیں۔

مسئلہ تناسخ اور جنم کا تصور

ان کے ہاں ایک بڑا مسئلہ تناسخ کا ہے۔ ان کے ہاں جزا سزا کا تصور موجود ہے لیکن اس کی عملی شکل یہ ہے کہ روح فنا نہیں ہوتی، روح انسان کے جسم میں ایک جنم گزارتی ہے، جب وہ اس سے نکل جاتی ہے تو اسے ایک نیا جسم دیا جاتا ہے، نئے جسم میں منتقل ہوتی رہتی ہے، جنم بدلتی رہتی ہے۔ اس کو تناسخ کہتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ سم نئے سیٹ میں ڈال دی ہے۔ آپ نے محاورہ سنا ہوگا ''جنم جنم کا ساتھ''۔ اسی طرح ''اگلے جنم میں ملیں گے''، ''رام اگلے جنم میں ملا دے''۔ اس کی وجہ یہی عقیدہ ہے یہ ساری باتیں اس تناسخ کے عقیدے پر مبنی ہیں۔ ان کے ہاں نیکی اور بدی کے تصور کے مطابق

اگر زندگی اچھی گزاری ہے تو اگلا جنم بہتر ملتا ہے۔ پہلے جانور کی شکل میں تھا، دوسرے جنم میں انسانی شکل میں آجائے گا۔ پہلے شودر تھا تو اب برہمن کی شکل میں آجائے گا۔ یعنی پہلے سے اچھی صورت مل جاتی ہے۔ اور اگر بری زندگی گزاری ہے اور سزا کا مستحق ہے تو انسان کسی جانور مثلاً سانپ، کتے، گدھے کی شکل میں اگلے جنم میں آجائے گا۔ جنم کا بدلنا اور بہتر یا بری شکل میں آنا سزا جزا کا تصور ہے۔ تناسخ کا عقیدہ ان کا بنیادی عقیدہ ہے۔

یہ فرق ذہن میں رکھیں کہ جدید ہندو سوسائٹی نے مذہبی پابندیاں ختم کر دی ہیں۔ اب تو ہندوستان میں قوانین سیکولر ہیں، پرانے مذہبی معاشرتی قوانین سے دستبرداری اختیار کر رکھی ہے، ان کے مذہبی رہنما مذہبی و معاشرتی روایات پر اسٹینڈ نہیں لے رہے۔ یہاں ہم سے بھی تقاضا ہے کہ معاشرتی قوانین میں مذہب سے دستبرداری اختیار کرو، مذہب کو عبادات کے دائرے میں محدود رکھو۔ ہم یہ نہیں کر رہے اور ہم اسٹینڈ لیے ہوئے ہیں۔

خاوند اور بیوی کا تعلق

بہرحال ہندوستان میں بعض مذہبی روایات پر اب بھی عمل ہوتا ہے جن میں مثلاً یہ کہ ان کے ہاں طلاق کا سرے سے کوئی تصور نہیں ہے، نکاح جو ہو گیا تو اب ہمیشہ ہمیشہ کا ساتھ ہو گیا۔ خاوند کے فوت ہونے کے بعد بھی بیوی کو مذہبی طور پر نئے نکاح کی اجازت نہیں ہے، خواہ وہ جوان عورت ہو۔ اگلے جنم میں اسی کی بیوی ہو گی۔ خاوند کے مرنے سے بھی نکاح ختم نہیں ہوتا اور عورت کے لیے دو آپشن ہوتے ہیں:

۱. باقی ساری زندگی خاوند کے گھر میں ایک خادمہ یا نوکرانی کی شکل میں گزار دے۔ سوگ کی کیفیت میں رہے گی کہ خوشبو نہیں لگائے گی، اچھے کپڑے نہیں پہنے گی، زینت اختیار نہیں کرے گی۔

۲. دوسرا اُن کے ہاں عزیمت کا مقام یہ ہے کہ خاوند کی لاش جب جل رہی ہو عورت اس آگ میں کود کر جان دے دے۔ اس کو ستی ہونا (قربان ہونا) کہتے ہیں اور اس کو بہت بڑا درجہ دیا جاتا ہے، شہادت ہی کا درجہ سمجھتے ہیں۔ اب آزادی کے بعد ہندوستانی حکومت نے قانوناً اس پر پابندی لگا رکھی ہے کہ کوئی عورت ایسا نہیں کر سکتی، لیکن اس کے باوجود دور دراز علاقوں

میں ایسے ہو جاتا ہے کہ عورت خاوند کی چِتا (جلتی ہوئی لاش) پر سَتی ہو جاتی ہے۔ سَتی ہو جانے کی ان کے ہاں بڑی معروف روایت ہے۔

ذات پات کا معاملہ

ان کے ہاں جو بڑا مسئلہ ہے وہ ہے ذات پات کا مسئلہ۔ سوسائٹی میں چار درجے ہیں اور چاروں کی درجہ بندی، احکام اور دائرے الگ ہیں:

۱. سب سے اعلیٰ درجہ کی ذات برہمن کی ہے جو برہما کی طرف منسوب ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ شاید حضرت ابراہیمؑ کی طرف نسبت ہے اور یہ ابراہیمی مذہب کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ بہرحال یہ قیاس آرائیاں ہیں۔ برہمن کے کام کا بنیادی دائرہ علمی اور مذہبی ہے۔ تعلیم اور مذہب برہمن کے اختیارات اور فرائض میں سے ہے کہ وہ کس حد تک علم حاصل کرتے ہیں اور کتنا دین سکھاتے ہیں۔ پنڈت برہمنوں میں سے ہوتے ہیں۔ ان کا بنیادی کام مذہبی رسومات ادا کرنا اور مذہب کی تعلیم دینا ہوتا ہے۔ سب سے برتر اور مقدس یہ طبقہ سمجھا جاتا ہے۔

۲. دوسرے نمبر پر کھشتری ہیں۔ ان کا کام حکمرانی، فوج، پولیس، انتظامیہ، اور مملکت کے اجتماعی کام سرانجام دینا ہوتا ہے۔

۳. تیسرے نمبر پر ویش کی ذات ہے۔ تجارت وزراعت وغیرہ کرتے ہیں۔

۴. سب سے نچلی اور حقیر ذات شودر کی ہے۔ ان کے ذمے صرف خدمت کے کام ہیں۔ اوپر والے طبقوں کی خدمت کے کام کرنا۔ اور حیثیت ان کی یہ ہے کہ ان کے ساتھ برابر نہیں بیٹھ سکتے ہیں، ان سا لباس نہیں پہن سکتے، ان جیسا طور طرز اختیار نہیں کر سکتے۔ شودر کسی برہمن سے مصافحہ بھی نہیں کر سکتا، اگر ہاتھ ملا لے تو برہمن کے ہاتھ پلید سمجھے جاتے ہیں۔

اس ذات پات کے فرق سے نفرت کرتے ہوئے باباگرونانک نے ہندو مذہب چھوڑ دیا تھا۔ یہ ذات پات کا فرق اب بھی موجود ہے اگرچہ قانوناً ختم کر دیا گیا ہے۔ معاشرتی فرق تو ہمارے ہاں بھی ہے، چوہدری اور کمّی کا، لیکن یہ معاشرتی ہے، مذہبی نہیں ہے۔ تمام تر خرابیوں کے باوجود مذہبی طور پر آج بھی الحمدللہ عید اور جمعے کے موقع پر کوئی فرق نہیں برتا جاتا۔ کوئی کسی کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم کمّی ہو

پیچھے کھڑے ہو۔ وہ آگے کھڑا ہے تو چوہدری کے پیچھے ہی کھڑا ہوگا۔ یہ تو تھیں ان کی بطور مذہب کے چند علامات۔

ہندو مسلم کشمکش کا دور

ہمارے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ مسلمانوں کے ساتھ ان کی کشمکش کا باقاعدہ آغاز تب ہوا تھا جب محمد بن قاسمؒ سندھ پر حملہ آور ہوئے تھے اور سندھ میں ان کا مقابلہ راجہ داہر سے ہوا تھا۔ محمد بن قاسمؒ نے راجہ داہر کو شکست دے کر سندھ اور ملتان تک کا علاقہ فتح کیا۔ پھر ہمارے دوسرے بڑے فاتح سلطان محمود غزنویؒ جب آئے تو ان کی جنگیں بھی ہندوؤں سے ہوئیں اور سومنات مندر تک پہنچتے ہوئے سترہ حملے کیے۔ سترہویں حملے میں غزنوی کو کامیابی ہوئی۔ اس کے بعد سلطان شہاب الدین غوریؒ، قطب الدین ایبکؒ، پھر بابرؒ۔ ان کے ساتھ ہماری جو آخری بڑی جنگ ہوئی وہ احمد شاہ ابدالیؒ کی مرہٹوں کے ساتھ ہوئی۔

متحدہ ہندوستان میں اسلام تین راستوں سے آیا ہے:

۱. ایک تو محمد بن قاسمؒ اور محمود غزنویؒ وغیرہ فاتحین کے ذریعے۔

۲. مشرقی ہند بمبئی وغیرہ میں عرب تاجروں کے ذریعے اسلام آیا۔

۳. اور وسطی ہند میں اسلام صوفیاء کے ذریعے آیا، خواجہ معین الدین اجمیری، سید علی ہجویری، شاہ محمد غوث وغیرہ صوفیاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہاں آکر ماحول بنایا اور اسلام کا سبب بنے۔

مسلمانوں نے متحدہ ہندوستان پر تقریباً ایک ہزار سال حکومت کی ہے، آٹھ سو سال تو مغلوں نے کی ہے، ان سے پہلے قطب الدین ایبکؒ، شیر شاہ سوریؒ نے حکومت کی۔ لیکن ہم نے یہاں حکومت کی ہے طاقت کے زور سے۔ اس زمانے کا اصول ہی یہی تھا کہ جس کے پاس طاقت ہے وہ قبضہ کر لیتا۔ ہمارے پاس جب تک طاقت رہی ہم نے حکومت کی۔

جب انگریز آیا تو ہم دونوں مغلوب ہو گئے۔ ہماری پرانی فقہی بحثوں میں ایک بحث چلتی ہے کہ ہندوستان کی کون سی زمین عشری ہے اور کون سی خراجی ہے۔ جو ہم نے غلبے سے قبضہ کیا ہے اس

زمین کا حکم الگ ہے، اور جو علاقہ از خود مسلمان ہو کر شامل ہو گیا اس کا حکم الگ ہے۔ یہ ساری بحثیں ہماری تب تک تھیں جب ہم غالب تھے اور ہندو مغلوب تھے۔ انگریز کے آنے کے بعد ہم دونوں مغلوب ہو گئے تھے، ہماری پہلے والی پوزیشن نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد انگریز کے خلاف جو ہم نے آزادی کی جنگ لڑی تو ہم نے مل کر لڑی۔ اب نئے فقہی احکام غالب مغلوب کے پرانے دائرے میں نہیں ہوں گے بلکہ معاہد کے دائرے میں ہوں گے کہ ہم نے مل کر انگریز سے آزادی حاصل کی ہے، اب ان کا حکم ذمی کا نہیں ہوگا، معاہد کا ہوگا۔

مغلوں کے زوال کے بعد ہندو مسلم تعلقات

۱۸۲۰ء، ۱۸۲۱ء میں دہلی پر انگریزوں کا ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے اقتدار قائم ہو گیا تھا، تب سے صورتحال بدل گئی ہے۔ اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے:

۱. ایک حصہ، جس کی قیادت سر سیّد احمد خان مرحوم کر رہے تھے، نے کہا کہ اب ہم مسلم ہندو ایک پوزیشن میں آ گئے ہیں تو ہمیں اپنا تشخص تسلیم کرانا چاہیے۔ اپنے آپ کو الگ ایک قومیت کا رنگ دینا چاہیے کیونکہ آئندہ فیصلے ووٹ کے ذریعے ہوں گے اور اس میں جس کی اکثریت ہوگی اس کی حکومت ہوگی، اس لیے ہمیں اس میں ضم ہونے سے بچنے کے لیے اپنا تشخص قائم کرنا چاہیے۔ سر سیّد سے بہت سے معاملات میں اختلاف ہے لیکن دو معاملات میں سر سیّد نے جو جنگ لڑی ہے: (۱) ایک مسلمانوں کا الگ تشخص منوانے کے لیے کہ ہم مستقل قوم ہیں، (۲) اور دوسرا سر سیّد نے اردو کے لیے جنگ لڑی۔ اردو مسلمانوں کی زبان سمجھی جاتی تھی اور ہندی ہندوؤں کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ مدراس میں ہندی یونیورسٹی قائم ہونے کے بعد سر سیّد نے محنت کی کہ اردو کو بچانا ضروری ہے، ہمارا تشخص اردو کے تشخص کے ساتھ باقی رہے گا۔ یہ بھی گروہ کا موقف تھا کہ آنے والا دور چونکہ سیاست کا ہے، جمہوریت اور ووٹ کا ہے، اس لیے ہمیں اکثریت کے سامنے سرنڈر ہونے کی بجائے اپنا تشخص الگ منوانا چاہیے۔ جداگانہ قومیت، دو قومی نظریہ جو بالآخر ''نظریۂ پاکستان'' پر منتج

ہوا،اس کے پیچھے سوچ یہ تھی۔

۲. جبکہ دوسری سوچ یہ تھی کہ ہم نے ایک ہزار سال حکومت کی ہے، آئندہ بھی حکومت ہم ہی کریں گے اور یہاں حکومت میں ہمارا حصہ برابر ہو گا، تو ہمیں الگ نہیں ہونا چاہیے،اس سے نقصان ہو گا۔

یہ دو الگ الگ نقطۂ نظر تھے۔ ہمارے اکابر علماء بھی دو حصوں میں تقسیم تھے:

۱. حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ وغیرہم کا موقف یہ تھا کہ ہم ساتھ رہ کر آپس میں معاملات کر کے بہتر طور پر چل سکتے ہیں۔

۲. جبکہ حضرت تھانویؒ اور ان کے رفقاء کا موقف یہ تھا کہ نہیں، ہم ہندو اکثریت سے مغلوب ہو جائیں گے، اس سے بچنے کے لیے الگ ملک چاہیے۔ اس میں یہ بعد والا موقف غالب آ گیا،اس کے نتیجے میں پاکستان قائم ہوا۔

حضرات علماء کرام! ہندو مذہب کی چند تعارفی باتیں اور ہندو قوم کے ساتھ مسلم معاملات جو چلتے آ رہے ہیں اس کا ایک ہلکا سا خاکہ آج میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ ایک بات یہ کہ ہندو مذہب دعوتی مذہب نہیں، وطنی مذہب ہے۔ جو ہندوستان کا ہے وہ ہندو ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان کے جو لوگ مسلمان یا عیسائی ہو گئے ہیں انہیں واپس ہندو ہو جانا چاہیے، یہ ان کی شدھی تحریک کہلاتی ہے، ہندوستان سے باہر کے کسی آدمی کو یہ ہندو ہونے کی دعوت نہیں دیتے۔

سکھ مت

بابا گرونانک اور سکھ مذہب

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ سکھ مذہب کا آغاز کہاں سے ہوا تھا، اس کا پس منظر کیا ہے، اور اب کیا صورتحال ہے؟ آج اس پر بات کریں گے۔

سکھ مذہب پنجاب کا مذہب ہے، ان کی تاریخ زیادہ سے زیادہ پانچ سو سال کی ہے، اکبر بادشاہ کے زمانے میں ان کا آغاز ہوا۔ پہلے ایک بات سمجھنی ضروری ہے کہ سکھ مذہب کے بانی بابا گرونانک پہلے ہندو تھے۔ ''گرو'' مذہبی پیشوا کو کہتے ہیں جبکہ ''نانک'' ان کا نام تھا۔ مغلوں سے پہلے دہلی پر ابراہیم لودھی کی حکومت تھی، پھر بابر نے پانی پت کی لڑائی میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کیا تھا اور مغل سلطنت کا آغاز ہوا تھا۔ ابراہیم لودھی کے زمانہ میں ضلع شیخوپورہ میں تلونڈی گاؤں ہوتا تھا، اب یہ خود ضلع ہے اور اس کا نام بابا نانک کے نام پر ننکانہ صاحب رکھا گیا ہے۔ وہاں ایک ہندو گھرانے میں بابا نانک نے جنم لیا۔ جب جوان ہوئے، صوفی مزاج آدمی تھے، انہیں ہندو مذہب کی دو باتوں سے نفرت ہو گئی تھی:

۱. ایک بت پرستی سے کہ بابا نانک توحید کے قائل تھے،
۲. اور دوسرا ذات پات کے فرق سے۔

صوفیاء کرام اور خانقاہی نظام کی طرف رجوع

ان کا رجوع صوفیاء کرام حضرت بابا فریدؒ اور حضرت میاں میرؒ کی طرف ہو گیا۔ یہ زمانہ صوفیاء کرام کے عروج کا زمانہ تھا۔ بابا نانک صوفیاء کرام سے بہت متاثر ہوئے۔ ایک عرصہ بابا نانک نے صوفیاء کرام کے ساتھ گزارا، اسلام سے بالخصوص توحید اور مساوات سے متاثر ہوئے اور اس حد تک متاثر ہوئے کہ بابا نانک نے حج کیا، مدینہ منورہ حاضری دی، اور بغداد میں شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی قبر پر چلہ بھی کاٹا، لیکن بعد میں بات گڈمڈ ہو گئی۔

ہندوؤں میں ذات پات کا فرق ہے، برہمن کا دائرہ اور ہے، شودر کا دائرہ اور ہے، کھشتری کا دائرہ

اور ہے، ویش کا دائرہ اور ہے۔ چار ذاتیں ہیں، چاروں کے آداب الگ ہیں، سب برابر نہیں سمجھے جاتے۔ گھٹیا ذات والے کو بہت حقیر سمجھا جاتا ہے، برابر بیٹھ نہیں سکتا، جس برتن میں کھانا کھالے اس برتن کو پلید سمجھا جاتا ہے۔ ذات پات کا فرق ہندوؤں میں اب بھی ہے۔ باباگرو نانک کو بت پرستی کے علاوہ اس ذات پات کے فرق سے نفرت ہوئی اور اس نفرت میں پیچھے ہٹتے ہٹتے ان کا رجوع صوفیاء کرام کی طرف ہوگیا۔

ہمارے تصوف و سلوک کی بنیاد تو قرآن و سنت ہے لیکن کسی بھی سوسائٹی میں جا کر اثر و نفوذ کے لیے وہاں گھل مل کر سوسائٹی کی کچھ باتیں ہم نے اختیار کی ہیں تاکہ سوسائٹی کو متاثر کر سکیں۔ ہندوستان میں جب ہمارے صوفیاء کرام آئے تو بعض نے ہندو سوسائٹی کے ماحول میں خود کو پیش کرنے کے لیے جوگیوں وغیرہ کے طریقے اختیار کیے، جس کی وجہ سے ہم پر یہ الزام بھی ہوتا ہے کہ تصوف تم نے ہندوؤں سے لیا ہے۔ ایسا نہیں، بلکہ تصوف ہم اپنے ساتھ لائے تھے، تصوف کی بنیاد حضرت علیؓ اور حسن بصریؒ ہیں۔ اب چونکہ خانقاہی نظام اس درجے کا موجود نہیں ہے اس لیے سمجھ نہیں آ رہا۔ خانقاہی نظام کیا تھا؟ اس میں تین باتیں ہوا کرتی تھیں:

۱. ہر وقت اللہ کا ذکر
۲. ہر وقت لنگر
۳. اور جو بھی آئے اس سے پیار و محبت سے بات کی جائے، کسی کی نفی اور کسی سے نفرت نہ کی جائے۔

برصغیر کی خانقاہوں کی یہ تین بنیادیں رہی ہیں۔ اسی ماحول کی وجہ سے ہمارے صوفیاء کرام لاکھوں لوگوں کو مسلمان کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ کسی سے تعرض نہیں کیا، کسی سے مقابلہ نہیں کیا، جو بھی آیا اسے کھلایا پلایا، اسے اللہ اللہ کی تلقین کی، اللہ سے جوڑنے کی کوشش کی۔ جب وہ کچھ مانوس ہوا تو آہستہ آہستہ اس کو کلمہ پر لے آئے۔ باباگرو نانک نے بھی صوفیاء کرام سے متاثر ہو کر ان کے پاس آنا جانا اور ان سے استفادہ شروع کیا۔ بالخصوص حضرت بابا فریدؒ اور حضرت میاں میرؒ سے انہیں بہت عقیدت تھی۔ اور صوفیاء کرام سے بابا نانک اس حد تک متاثر ہوئے کہ انہوں نے حج بھی کیا اور بغداد میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی قبر پر چلہ بھی کاٹا، سکون کی تلاش میں۔

سکھ مذہب کا آغاز

باباگرو نانک ہندو مذہب سے نکلے مگر اسلام میں داخل نہیں ہوئے۔ قرآن مجید کی، حضورؐ کی اور اسلام کی باتوں کی تعریف کرتے ہیں لیکن کلمہ نہیں پڑھا، اسلام قبول نہیں کیا۔ کچھ ہندو تصوف، کچھ مسلم تصوف، کچھ توحید، کچھ رسمیں اور کچھ ذکر اذکار، ان سے ایک درمیانہ سا ملغوبہ بنا دیا۔ انہوں نے پیری مریدی شروع کر دی، ابتدا میں اس کی خانقاہی صورت تھی، بڑے صوفیاء کے پاس یہ جاتے، لوگ ان کے پاس آتے۔ انہوں نے گرنتھ کتاب لکھی جسے گروگرنتھ کہا جاتا ہے۔ یہ سکھوں کی مذہبی کتاب ہے، اس میں سنسکرت بھی ہے، پنجابی بھی ہے، قرآن کریم کی آیات بھی ہیں، جناب نبی کریمؐ کی احادیث بھی ہیں، بزرگوں کے اقوال بھی ہیں، اور بابا فرید کی کافیاں بھی ہیں۔

مذہبی علامات

سکھوں کی کچھ علامتیں بھی ہیں۔ پنج ککے یعنی کاف سے شروع ہونے والی پانچ چیزیں:

۱. کڑا: کڑا ہاتھ میں ضرور پہنتے ہیں۔
۲. کیس: ان کے ہاں مذہبی طور پر جسم کا کوئی بال کاٹنا جائز نہیں ہے، بڑے بڑے بال ہو جاتے ہیں جنہیں سنبھالنا پڑتا ہے، ان کا جوڑا بناتے ہیں، داڑھی سمیٹی ہوتی ہے۔
۳. کنگھا: کنگھا لازمی ان کے پاس ہوتا ہے۔
۴. کچھا: کچھا ضرور پہنتے ہیں۔
۵. کرپان: کرپان ہاتھ میں رکھتے ہیں، جو خنجر سے بڑی اور تلوار سے چھوٹی ہوتی ہے۔

سکھ داڑھی رکھتے ہیں اور پگڑی ضرور باندھتے ہیں، انہوں نے پگڑی کے لیے بڑی لڑائی لڑی ہے کہ یہ ہمارے ساتھ رہے گی۔ برطانیہ میں بھی انہوں نے اپنا حق منوایا ہے، امریکہ میں بھی منوایا ہے۔ یہ ان کی چند علامات ہیں۔

گردوارہ اور خانقاہ کی مناسبت

سکھ توحید پر بڑے پکے ہیں، بت پرستی اور شرک سے سخت نفرت ہے، ذات پات سے شدید نفرت ہے، ذکر اذکار اور گرنتھ پڑھنے کا ماحول ہے۔ میں نے امرتسر گولڈن ٹیمپل اور برمنگھم (برطانیہ) میں ان کے بہت بڑے گردوارہ کے علاوہ اور بھی گردوارے دیکھے ہیں۔ ان کی عبادت کا ماحول آپ کو بتا دیتا ہوں۔

برمنگھم برطانیہ کے گردوارہ کا احوال

برمنگھم گردوارہ میں ہر وقت لنگر چلتا رہتا ہے اور ان کے بقول اوسطاً یومیہ پانچ ہزار آدمی وہاں کھانا کھاتے ہیں۔ جو بھی جائے، مسلمان ہو، عیسائی ہو۔ ایک دن مولانا سلمان ندوی، مولانا محمد عیسیٰ منصوری اور میں گردوارہ دیکھنے گئے، انہوں نے اجازت دے دی۔ ہم نے کہا ہم آپ کا گردوارہ وزٹ کرنا چاہتے ہیں اور آپ کے یومیہ معمولات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے تشریف لائیں لیکن دو شرطیں ہیں:

۱. ایک تو یہ کہ آپ کو گردوارے کی حدود میں ننگے پاؤں آنا پڑے گا۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے۔
۲. دوسری شرط یہ ہے کہ جب آپ بڑے ہال میں داخل ہوں گے تو گرو گرنتھ کو سجدہ کریں گے، ماتھا ٹیکیں گے۔ ہم نے کہا ہم یہ نہیں کریں گے۔ انہوں نے کہا اس کے بغیر ہال کے اندر جانا منع ہے۔ ہم نے کہا یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی کو ماتھا ٹیکیں۔

بڑے ہال کے چاروں طرف دروازے تھے، درمیان میں تپائی اور چوکی سی رکھی ہوئی تھی جس پر گرو گرنتھ بہت بڑے سائز کی کتاب پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک گرو بیٹھا ہوتا ہے جو گرنتھ پڑھتا رہتا ہے۔ چوبیس گھنٹے اس کو پڑھنا جاری رہتا ہے۔ دو دو گھنٹے ان کی ڈیوٹی ہوتی ہے گرنتھ پڑھنے کی۔ بتایا گیا کہ پانچ سال سے ایک گھنٹے کا وقفہ بھی نہیں پڑا۔ جو بھی جس دروازے سے داخل ہو وہ پہلے گرنتھ کو ماتھا ٹیکتا ہے۔ ہم نے جب ماتھا ٹیکنے سے انکار کر دیا تو وہ کچھ پریشان بھی ہوئے کہ مہمان ہیں ان کو خالی واپس بھیجیں گے، اور ہماری ضد پر ناراض بھی ہوئے۔

ہر گردوارے کے ساتھ ان کی ایک کمیٹی ہوتی ہے جو پنج پیارے کہلاتے ہیں۔ کوئی پیچیدہ مسئلہ ہو تو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔ ہمیں انہوں نے کہا کہ پنج پیاروں سے پوچھنا پڑے گا۔ ہم نے کہا پوچھ لیں۔ چنانچہ پنج پیاروں کی میٹنگ ہوئی، ایک گھنٹہ میٹنگ ہوتی رہی۔ اب یہ بھی ان کے لیے مشکل تھا کہ ہمیں واپس کریں کہ ان کے خیال میں ہم محترم مہمان تھے، اور یہ بھی قبول نہیں تھا کہ ہمیں سجدے کے بغیر اندر جانے کی اجازت دیں۔ بہرحال ایک گھنٹے کی میٹنگ کے بعد بالآخر انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور کہا، اچھا آپ نے ماتھا نہیں ٹیکنا تو نہ ٹیکیں۔

انہوں نے تقریباً خانقاہی نظام کی نقل کی ہوئی ہے۔ ذکر اذکار، اللہ اللہ کرنا، تسبیح پڑھنا، گرنتھ کی تلاوت، اور لنگر جو ہر وقت چلتا رہتا ہے۔ ہمارے صوفیاء کرام کے پرانے خانقاہی نظام میں بھی یہی باتیں ہوتی تھیں، مسلسل ذکر اذکار اور مسلسل لنگر کہ جو بھی آئے کھانا کھائے۔

صوفیاء کرام سے عقیدت

صوفیاء کرام سے اب بھی بہت محبت کرتے ہیں، آپ کسی سکھ کے سامنے بابا فریدؒ کا نام لے لیں تو وہ آپ کا معتقد ہو جائے گا۔ میں ذاتی واقعہ عرض کرتا ہوں، لندن میں ایک جگہ میں نے بیگ خریدنا تھا، ایک سکھ کی دکان پر چلا گیا کہ پنجابی سمجھ لیتے ہیں۔ میں نے ایک اچھا سا بیگ پسند کیا۔ باتوں باتوں میں بابا فریدؒ کی ایک کافی میں نے پڑھ دی۔ دکان کا مالک کہنے لگا اب آپ سے پیسے کیوں لینے ہیں، آپ تو بابا فریدؒ کے ماننے والے ہیں، چنانچہ اس نے مجھ سے پیسے نہیں لیے۔

امرتسر گولڈن ٹیمپل اور حضرت میاں میرؒ

امرتسر کا معنٰی ہے آبِ حیات۔ امرتسر میں جو گولڈن ٹیمپل ہے، اس میں جانے کے لیے اس کے گرد احاطہ کیے ہوئے پانی کے چشمے میں پاؤں دھو کر ننگے پاؤں جانا پڑتا ہے۔ اس پانی کی ان کے ہاں وہی حیثیت ہے جو ہمارے ہاں زمزم کی ہے۔ گولڈن ٹیمپل کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے انہوں نے حضرت میاں میرؒ سے درخواست کی۔ حضرت میاں میرؒ ہمارے اکابر صوفیاء میں سے ہیں، لاہور میں ان کا مزار ہے۔ ہر سال میلہ لگتا ہے۔ میاں میرؒ یہاں سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ پیدل امرتسر گئے تھے اور گولڈن ٹیمپل کا سنگ بنیاد رکھا۔

یہ تو سکھوں کا مذہبی پہلو تھا کہ ہندوؤں سے الگ ہو گئے لیکن مسلمانوں میں شامل نہیں ہوئے، اور سکھ مت ایک نیا مذہب بن گیا جو پانچ سو سال سے چل رہا ہے۔

مغلوں اور سکھوں کی کشمکش

''گرو'' کا پس منظر

ابراہیم لودھی نے بابا گرونانک کو گرفتار کر لیا تھا، چار پانچ مہینے گرفتار رہے۔ بابر نے جب سلطنت حاصل کی تو انہیں رہا کر دیا اور عزت واکرام سے پیش آیا۔ جب بابا گرونانک فوت ہوئے تو ان کے بعد ان کے جو جانشین بنے وہ ''گرو'' کہلاتے تھے۔ سات پشتوں تک سکھوں کے تعلقات مغلوں کے ساتھ ٹھیک رہے۔ اس وقت تک یہ کچھ ترقی کر گئے تھے، کچھ منظم ہو گئے تھے، لاکھوں لوگ ان کے ساتھ مل گئے تھے۔ ان کے آٹھویں گرو رائے تیغ بہادر نے مغلوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ یہ اورنگزیب عالمگیر کا زمانہ تھا۔

اس کشمکش کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اورنگزیب نے جب حکومت حاصل کی تو باپ شاہجہان کو دہلی کے قلعے میں بند کر دیا تھا۔ اورنگزیب کی اپنے بھائیوں داراشکوہ اور شجاع کے ساتھ جنگیں ہوئی تھیں۔ باپ کی طرف سے داراشکوہ ہی نامزد تھا، وہ بھی صوفی طرز کا آدمی تھا، حضرت سلیم چشتیؒ کا مرید تھا اور ہندو جوگیوں کے ساتھ مل کر ملا جلا تصوف رکھتا تھا۔ جبکہ اورنگزیب بڑا موحد، دیندار اور کٹر سنی تھا۔ دونوں بھائیوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اورنگزیب تو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحریک کا آدمی تھا، اس تحریک نے جو لوگ تیار کیے ان میں سے ایک تھا، اورنگزیب نے اسی مشن کے مطابق کام کیا تھا۔

اورنگزیب کی داراشکوہ اور شجاع سے دہلی کے اقتدار کے لیے لڑائی ہوئی، اس جنگ میں سکھوں نے داراشکوہ کا ساتھ دیا۔ سکھ پوری جماعت کی حیثیت سے داراشکوہ کے ساتھ تھے، بڑی شدید جنگ ہوئی تھی۔ اورنگزیب نے داراشکوہ اور شجاع کو شکست دے کر قتل کر دیا تھا اور دہلی کا اقتدار سنبھال لیا

تھا۔ اس کشمکش میں چونکہ سکھ اورنگزیب کے خلاف تھے اس لیے ظاہر بات ہے اورنگزیب نے ان کو برداشت نہیں کرنا تھا۔ ان کے آٹھویں گرو رائے تیغ بہادر کو اورنگزیب نے گرفتار کر کے قتل کر دیا تھا۔ پھر نویں گرو کے بعد انہوں نے کسی شخص کو گرو نہیں بنایا، بلکہ کہا کہ گرنتھ ہمارا گرو ہے، اسے کون قتل کرے گا؟ گرنتھ کو گرو بنالیا اور اب تک گرنتھ ہی ان کا گرو ہے، اس لیے اسے گرو گرنتھ کہتے ہیں۔ اورنگزیب نے چونکہ ان کو خاصا پریشان کیا تھا اس لیے اورنگزیب کو ''رنگا'' کہتے ہیں۔

ایک سکھ سردار کے ساتھ شکووں کا تبادلہ

ایک لطیفہ یہ ہوا کہ لندن میں ساؤتھال کے علاقے میں میرا جانا رہتا تھا۔ وہاں سکھ اکثریت ہے، ان سے میل ملاقات بھی رہتی تھی۔ وہاں ایک پروفیسر تھے، ایک دن میں نے ان سے کہا سردار جی!

- آپ نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جو کچھ ہمارے ساتھ کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جنرل بخت خان نے دہلی پر قبضہ کر لیا تھا، وہاں سے انگریزوں کو نکال دیا تھا۔ پنجاب سے سکھوں کی پندرہ ہزار تازہ دم فوج گئی، انہوں نے قبضہ چھڑوا کر انگریزوں کو بحال کیا تھا، یہ تاریخی واقعہ ہے۔
- اور پھر ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں مشرقی پاکستان میں جو سلوک ہمارے ساتھ کیا ہمیں قیامت تک نہیں بھولے گا، یہ زخم ہمیشہ تازہ رہیں گے۔

انہوں نے جواب میں کہا، ٹھیک ہے یہ ہم نے کیا، لیکن جو ہمارے ساتھ رنگے (اورنگزیب) نے کیا تھا وہ بھی ہمیں قیامت تک نہیں بھولے گا۔ ان کی بات بھی ٹھیک تھی، اورنگزیب نے ان کے ساتھ اچھا خاصا کیا تھا، وہاں سے کشمکش شروع ہوئی۔

سکھ ریاست کا دور

ان کا سیاسی پہلو یہ ہے کہ جب اورنگزیب کے بعد مغلوں کی حکومت کمزور ہوئی اور مسلسل زوال کا شکار ہوئی تو سکھ پنجاب کے علاقے میں خاصے پھیل چکے تھے۔ انہوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔

جس طرح ہندوستان کے باقی لوگ خود مختار ہونے لگے، یہ بھی خود مختار ہونے لگے۔ سیاست میں مقابلے پر تو یہ گرو تیغ بہادر کے زمانے میں ہی آ گئے تھے، اورنگزیب کے بعد ان کو موقع ملا تو انہوں نے سکھ ریاست کا آغاز کیا۔ مذہب کا آغاز ننکانہ صاحب سے، اور سکھ ریاست کا آغاز گوجرانوالہ سے ہوا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت

مہاراجہ رنجیت سنگھ گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے تھے۔ شیرانوالہ باغ میں مہان سنگھ، جو کہ رنجیت سنگھ کا باپ تھا، کی مڑھی بھی ہے۔ ہمارے ہاں تو مردے کو دفن کیا جاتا ہے، ہندوؤں کے ہاں روایت چلی آ رہی ہے کہ مردے کو جلایا جاتا ہے، جلا کر اس کی راکھ کو کسی مٹی کے برتن میں محفوظ کیا جاتا ہے، اس کو کہیں دفن کیا جاتا ہے وہ مڑھی کہلاتی ہے۔ اس زمانے میں چھوٹے چھوٹے گاؤں ہوتے تھے جو مسل کہلاتے تھے، رنجیت سنگھ ایک مسل کا حکمران تھا، ایسے ہی سمجھ لیں جیسے پہلے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے نواب ہوتے تھے۔

جب انگریز برصغیر سے گیا تو یہاں اس طرح کی پانچ سو ریاستیں تھیں۔ رنجیت سنگھ کی بارہ دری شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں ہے۔ گوجرانوالہ ان کا دارالحکومت رہا ہے، پھر ایمن آباد شہر دارالحکومت رہا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ سکھوں نے حکومت قائم کرنا شروع کی۔ پھر لاہور ان کے قبضے میں آیا، آگے ملتان تک گئے، انبالہ لدھیانہ تک، شمال کی طرف ہزارہ، ڈیرہ اسماعیل خان، ڈیرہ غازی خان، مردان، بنوں، گلگت، بلتستان، پشاور، کشمیر اس پورے علاقے پر سکھوں نے قبضہ کیا۔ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت عروج پر تھی تو ملتان سے لے کر کابل تک حکومت تھی۔ ۱۸۵۷ء سے دس سال پہلے تک یہ علاقہ سکھوں کا ملک رہا ہے۔ ۱۸۴۵ء یا ۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے ان کو شکست دی اور ان علاقوں پر قبضہ کیا۔ مسلمانوں کے ساتھ سکھوں کے تعلقات کا ایک وہ دور تھا جب مغلوں سے علاقے چھین کر انہوں نے اپنی ریاست بنائی، مغل کمزور پڑ گئے تھے، انہوں نے یہ سارے علاقے مغلوں سے ہی چھینے تھے۔

جہادِ بالاکوٹ کا پس منظر

اس کے بعد ہمارا اور سکھوں کا جو بڑا معرکہ ہوا وہ ہے بالاکوٹ کا معرکہ۔ اس میں انگریز پیچھے بیٹھ کر ان کو سپورٹ کر رہا تھا اور تماشا دیکھ رہا تھا۔ ہوا یوں کہ جب شاہ عالم ثانی کے زمانے میں دہلی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا اعلان ہوا تو شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے اس ملک کو دارالحرب قرار دے دیا۔ آزادی کی جنگ کی فرضیت کا حکم دے دیا تو شاہ اسماعیل شہیدؒ جو آپؒ کے شاگرد اور بھتیجے تھے، سید احمد شہیدؒ ان کے شاگرد تھے، انہوں نے ٹونک ریاست کی فوج میں شامل ہو کر ٹریننگ حاصل کی۔

یہ ۱۹۳۰ء سے پہلے کا زمانہ تھا۔ اس دور کا منظر یہ تھا کہ پنجاب سکھوں کی آزاد ریاست تھی جبکہ سندھ، راجھستان اور افغانستان مسلمانوں کی آزاد ریاست تھی۔ انہوں نے منصوبہ بنایا کہ آزادی کی جنگ لڑنے کے لیے پہلے بیس کیمپ بنائیں گے، اس کے لیے پشاور کا انتخاب کیا، اس لیے کہ پیچھے افغانستان کی آزاد ریاست ہے، بیس کیمپ کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ خود مختار علاقہ ہو اور اس کے ساتھ کسی آزاد ملک کی سرحد ہو، یعنی پشت پر قوت بھی ہو، ویسے ہی درمیان میں بیٹھ جانا حماقت ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے حکمتِ عملی یہ اختیار کی، اور ابتدا کی اصلاحِ معاشرہ کے نام سے۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تحریک کے ابتدائی ایک دو سال میں جہاد کا لفظ نہیں ملے گا۔ پنجاب کی کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ سکھوں کے مسلسل اقتدار کی وجہ سے دیہات کی مسجدیں ویران ہو گئی تھیں۔ بادشاہی مسجد گھوڑوں کا اصطبل تھی۔ تو انہوں اذان اور نماز بحال کرنے، مسجدیں آباد کرنے، اصلاحِ رسوم اور اصلاحِ معاشرہ کے عنوان سے سلسلہ شروع کیا۔ پورے علاقے کا دورہ کیا اور جماعت بنائی۔ پھر پورا قافلہ حج پر گیا۔ اس کے بعد دہلی سے راجھستان اور سندھ وغیرہ سے ہو کر پشاور پہنچے۔ سندھ میں تالپوروں کی حکومت تھی، ابھی انگریزوں نے قبضہ نہیں کیا تھا اور حضرت شاہ محمد راشد قادریؒ، جن سے سلسلہ عالیہ قادریہ راشدیہ منسوب ہے، کے زمانے میں ان کے ہاں پیر جو گوٹھ کی خانقاہ میں مہمان رہے، شاہ محمد راشدؒ کے مریدین بھی اس وقت سے جہاد سے جڑے، حروں کا سارا گروہ اور پیر پگارا سب وہی ہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ بگاڑ آتا گیا۔

میں نے پیر جو گوٹھ میں وہ علاقہ دیکھا ہے جہاں ان کا ٹھکانہ ہوتا تھا، اور مجھے بتایا گیا کہ جب ہجرت اور جہاد کی نیت سے وہ آگے نکل رہے تھے تو ان کے خاندان بھی ساتھ تھے۔ پیر صاحب آف

پگاراشاہ محمد راشدؒ نے ان سے کہا کہ آپ خاندان ساتھ نہ لے جائیں، یہاں چھوڑ جائیں ہم حفاظت کریں گے۔ وہ محلہ میں نے دیکھا جہاں وہ خاندان چھوڑ کر آگے نکلے تھے۔ پشاور میں ۱۸۳۰ء میں ان کی جنگ ہوئی، انہوں نے پشاور فتح کیا، پنجتار کا علاقہ صوابی کے ساتھ ان کا سالہا سال تک مرکز رہا ہے۔ میں نے وہ تربیتی مرکز بھی دیکھا ہے۔ ۱۸۳۰ء میں ان کی حکومت قائم ہوئی، انہوں نے یہ علاقہ سکھوں سے چھینا تھا۔ مگر ان کی حکومت چھ ماہ سے زیادہ نہیں چل سکی، ان کو نظر آگیا تھا کہ یہاں ہمارا چلنا مشکل ہے، تو پھر متبادل پناہ گاہ اور بیس کیمپ کی تلاش میں تھے۔

مظفر آباد کشمیر کے علاقے کے لوگوں نے ان سے رابطہ قائم کیا کہ آپ ہمارے پاس آجائیں، یہاں مرکز بنائیں گے۔ چنانچہ یہ پورا قافلہ اوپر کے راستے سے، کیونکہ شیر سنگھ رنجیت سنگھ کا بیٹا ان کے تعاقب میں تھا، مظفر آباد جاتے ہوئے بالاکوٹ تک پہنچے، وہاں ان کا ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو مقابلہ ہوا جس میں انہیں شکست ہوئی اور وہاں شہید ہوئے۔ پلاننگ ان کی یہ تھی کہ علاقے پر قبضہ کر کے اپنی حکومت بنائیں گے۔

''مکاتیب سید احمد شہیدؒ'' مولانا سید نفیس الحسینیؒ نے بڑی محنت کر کے چھپوائے ہیں، اس وقت کے معاصرین سے ان کی خط وکتابت اس میں مذکور ہے، اس سے ساری بات واضح ہو جاتی ہے۔ اس پر اگر آپ پڑھنا چاہیں تو غلام رسول مہر مرحوم کی ''سرگذشتِ مجاہدین'' اور مولانا علی میاںؒ کی ''تاریخِ دعوت وعزیمت'' میں آپ کو تفصیلات ملیں گی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ اور بعد کی صورتحال

پھر ۱۸۵۷ء کا معرکہ پورے ملک میں ہوا۔ دہلی وغیرہ میں جنرل بخت خانؒ اور شاملی کے محاذ پر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ وغیرہ سبھی بزرگ، کوئی انبالہ میں، کوئی میرٹھ میں، کوئی دہلی میں، مختلف بغاوتیں ہوئیں۔ دہلی پر جنرل بخت خانؒ نے قبضہ کر لیا۔ پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، سکھوں کے ساتھ ان کے معاہدات ہو گئے، اس معاہدہ کے تحت انگریزوں نے سکھوں کی مدد کی تھی اور دہلی پر انگریزوں نے قبضہ واپس لے لیا۔

۱۸۵۷ء تک کی داستان یہ تھی، جس سے پہلے ہماری ہندو، سکھ، مسلم کی آپس میں لڑائیاں چلتی رہی ہیں۔ احمد شاہ ابدالیؒ کی پانی پت میں لڑائی ہندوؤں سے ہوئی تھی۔ سکھ، ہندو اور مسلمان آپس میں متحارب طاقتیں تھیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد صورتحال بالکل بدل گئی، پورے ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ ہندو، سکھ اور مسلمان سبھی محکوم ہوگئے۔ اس سے آزادی کی تحریک کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

تحریکِ آزادی میں کردار اور پنجاب کی تقسیم

آزادی کی مسلح تحریکوں اور سیاسی تحریکوں میں سکھ بھی شامل تھے۔ پاکستان بننے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پاکستان کے قیام کے موقع پر ایک مسئلہ کھڑا ہوگیا کہ مشرقی پنجاب میں سکھوں کی اکثریت تھی، مغربی پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس زمانے میں بہت سے دانشوروں نے کوشش کی کہ پنجاب تقسیم نہ ہو، سکھ اور مسلمان اکٹھے رہیں، لیکن سکھوں نے انکار کر دیا۔ اگر سکھ پاکستان کی تحریک کا ساتھ دیتے تو نتیجہ یہ ہوتا کہ مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب دو صوبے الگ بن جاتے، خون ریزی نہ ہوتی، اور کشمیر کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ ماسٹر تارا سنگھ ان کے بڑے لیڈر تھے، پنجاب اسمبلی کے ممبر بھی تھے۔ ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب اسمبلی کے باہر تلوار لہرا کر کہا تھا کہ ہم اس تلوار کے ساتھ پاکستان کو روکیں گے، پھر وہ تلوار جو چلی اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا، الامان الحفیظ۔

''خالصتان'' کی تحریک

اس کے بعد سکھ ہندوستان کا حصہ چلے آرہے ہیں لیکن مطمئن نہیں ہیں۔ انہوں نے ایک دور میں خالصتان کی تحریک شروع کی اور مطالبہ کر دیا کہ انہیں الگ کر دیا جائے۔ ''خالصہ'' ان کی اصطلاح ہے، بہادر آدمی اور جنگجو خالصہ کہلاتے ہیں، اور سنگھ بھی شیر کو کہتے ہیں۔ ایک اور بات دلچسپی کی یہ ہے کہ سکھوں نے ایک دور میں قادیانیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے بابا گرو نانک کو پیغمبروں کی فہرست میں لکھا ہے۔ لندن میں قادیانی بھی خاصے ہیں اور سکھ تو بہت زیادہ ہیں۔ انہوں نے وہاں تحریک یہ چلائی تھی کہ خالصتان کو الگ کیا جائے۔ اس کے ساتھ پاکستان اور ہندوستان سے بین الاقوامی مطالبہ کیا گیا کہ ننکانہ صاحب اور قادیان کو اوپن سٹی قرار دیا جائے۔ اوپن سٹی کا معنٰی اندرونی خود مختاری کہ ان کی اپنی حکومت ہو۔ اس کے لیے بڑی کمپین ہوئی لیکن ان کو جلدی سمجھ آگیا کہ

قادیانیوں کو ساتھ ملانا فائدہ مند نہیں ہے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ سکھ اپنی آزاد ریاست چاہتے ہیں، ضیاء الحق مرحوم نے ان کو سپورٹ بھی کیا تھا۔ اگر ضیاء الحق مرحوم زندہ ہوتے تو وہ تحریک کسی نتیجے پر پہنچ چکی ہوتی لیکن ان کی تحریک ناکام رہی۔ کشمیر والے تو لڑ رہے ہیں، سکھ لڑ نہیں رہے لیکن ان کی خواہش ہے کہ ہم آزاد ہوں۔

سکھوں کی زیادہ تر آبادی مشرقی پنجاب میں ہے، برطانیہ میں بھی سکھوں کی بہت بڑی آبادی ہے۔ مشرقی پنجاب کے بعد ان کا سب سے بڑا مرکز کینیڈا ہے۔ وہاں کی سیاست میں بھی ان کا عمل دخل ہے اور ابھی دو سال پہلے کینیڈا نے پنجابی کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا ہے۔ سکھ بولتے پنجابی ہیں، لکھتے گرمکھی میں ہیں۔

طالبان حکومت اور کابل کے سکھ

ایک واقعہ سناتا ہوں، جس زمانے میں طالبان کی حکومت تھی، مجھے ایک وفد کے ساتھ کابل جانے کا اتفاق ہوا۔ کابل میں سکھ خاصے آباد تھے، وہاں بازار میں سکھوں کی کپڑے کی چند دکانیں نظر آئیں، میں ایک دکان میں داخل ہوا اور پنجابی میں کہا سردار جی کیا حال ہے؟ وہ بڑے خوش ہوئے، چائے وغیرہ منگوائی۔ ہماری گفتگو چل پڑی۔ زبان کا انس بڑا انس ہوتا ہے اور میں ہمیشہ اس سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔ میں نے باتوں باتوں میں ان سے سوال کیا سردار جی! یہ مولویوں کی (طالبان کی) حکومت آئی ہے تو آپ نے کیا محسوس کیا، کیا فرق پڑا ہے؟ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا، گیانی جی! (مولوی کو گیانی جی کہتے ہیں) جب سے مولوی آئے ہیں ہم آرام کی نیند سوتے ہیں۔ میں نے پوچھا، کیا مطلب؟ کہنے لگا پہلے بہت افراتفری تھی، کوئی امن نہیں تھا، ہم تین باپ بیٹے ہیں، آٹھ آٹھ گھنٹے ڈیوٹی دیتے تھے، ایک جاگتا تھا دو سوتے تھے۔ اب مولوی پہرا دیتے ہیں اور ہم سوتے ہیں۔ میں نے اس پر ایک کالم میں پوری تفصیل لکھی تھی۔

آج میں نے سکھوں کا کچھ اجمالی تعارف کروایا ہے کہ یہ ہماری معاصر قوم ہے اور پڑوسی قوم ہے۔ ہمارے ساتھ ان کے جھگڑے بھی ہیں، کئی معاملات میں صلح بھی ہے، لیکن یہ ایک مذہب چل رہا ہے جو کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں موجود ہے۔

بدھ مت

پس منظر

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ حضرات علماء کرام! آج بدھ مذہب کے بارے میں تعارفی معلومات مہیا کی جائیں گی۔ بدھ ازم یا بدھ مت، یہ مہاتما بدھ کے نام سے متعارف ہے۔

یہ مذہب اس وقت کہاں کہاں ہے؟ اردو انسائیکلو پیڈیا کی روایت کے مطابق بدھ دنیا میں تقریبًا پچیس، تیس کروڑ ہیں۔ یہ سب سے زیادہ چین میں ہیں، جاپان میں بھی اکثریت ہے، نیپال، سری لنکا، تھائی لینڈ، انڈیا میں بھی ہیں، اور برما میں تو باقاعدہ بدھوں کی حکومت ہے۔ برما کا پرانا نام میانمار انہوں نے زندہ کیا اور رنگون کا نام ینگون کر دیا ہے۔ رنگون ہمارے لیے بہت سے حوالوں سے تاریخی مقام ہے کہ بہادر شاہ ظفر کو جب دہلی کی سلطنت سے معزول کر کے گرفتار کر لیا گیا، اس پر مقدمہ چلا تو جلاوطن کر کے اسے رنگون میں قید کر دیا گیا، اس کی قبر رنگون برما میں ہے۔

چین والے بدھ ہی تھے لیکن ماؤزے تنگ نے جب چین میں مذہب کے خلاف تحریک چلائی تو مذہب کی علامات مٹا ڈالیں۔ مذہب کے متعلق جو باتیں ہیں وہ وہاں ضبطِ نفس کے عنوان سے ہیں، مذہب کے عنوان سے نہیں ہیں، البتہ نسلاً وہ بدھ ہیں۔

مہاتما بدھ

مہاتما بدھ کا اصل نام ''سدارتھا بوتم'' ہے۔ ''مہاتما'' خدا کی صفات کے مظہر کو کہتے ہیں۔ مہاتما بدھ پانچ سو سال قبل مسیح ہندوستان کے علاقے میں راجہ شدودھن کے ہاں پیدا ہوئے جو کہ ہندو کھشتری ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی پیدائش نیپال کی سرحد کے قریب بھارت میں اور بعض مؤرخین کے مطابق بنارس کے شمال میں ایک سو کلو میٹر کے فاصلے پر ایک بستی میں ہوئی۔ وہاں راجہ نے مہاتما بدھ کو اپنے ساتھ ریاست کے معاملات میں شریک کیا لیکن طبعًا یہ اپنے ماحول سے باغی تھے۔ جیسے بابا نانک بھی ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے لیکن اپنی کچھ روایات اور ماحول سے باغی تھے، مثلاً بت پرستی اور ذات پات سے۔ ہندو مذہب رسموں کا ہی دین بن کر رہ گیا تھا۔

ہمارے ہاں بھی اور عیسائیت و یہودیت میں بھی یہ بحث چلتی آ رہی ہے کہ ایک ہے عبادت اور ایک ہے عبادت کی مقصدیت۔ یہودی رسوم پر زیادہ زور دیتے تھے، عیسائی زیادہ اس کی روح پر زور دیتے تھے۔ ہمارے ہاں بھی معتزلہ اور صوفیاء کے ہاں یہ فلسفیانہ سی بحث چلتی آ رہی ہے۔ فطری بات ہے جب معاشرے کو ظاہری رسوم میں ہی جکڑ لیا جائے اور مقصدیت پیچھے ہو جائے تو کچھ افراد کو اس سے نفرت ہو گی۔

اس طرح کا ماحول پیدا ہو گیا تو مہاتما بدھ کی توجہ ذکر اذکار اور دنیا سے کنارہ کشی اور رہبانیت کی طرف ہو گئی۔ ہندو جوگیوں میں یہ رہبانیت پائی جاتی ہے جو جنگلوں میں جا کر علیحدہ رہتے اور وہاں ریاضتیں کرتے ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ انہوں نے دنیا چھوڑ دی۔ ان کے ہاں یہ مہاتیاگ بڑی رہبانیت کہلاتی ہے۔ ان کی ایک اصطلاح نروان کی بھی ہے، یعنی اتنی ریاضت کہ دنیا کی رغبت دل میں نہ رہے اور نروان (نجات) حاصل ہو جائے۔

مہاتما بدھ کچھ عرصہ باپ کے ساتھ رہے پھر کوئی جوگی مل گیا تو اس کے ساتھ جنگل کو چل دیے اور نروان کے حصول کے لیے ریاضتیں کرتے رہے۔ ذاتی طور پر رحمدل، رقیق القلب آدمی تھے کہ کسی جانور کا قتل بھی انہیں اچھا نہیں لگتا تھا۔ اخلاقیات بھی بہت اچھی تھیں۔ ان کے بنیادی عقائد جن پر اس مذہب کی بنیاد ہے اس میں یہ کہ انسان کی فطرت میں دکھ شامل ہے۔ ہمارے ہاں بھی صوفیاء کے ہاں یہ تصور موجود ہے۔

دریں دنیا کسے بے غم نباشد
اگر باشد بنی آدم نباشد

ان کا فلسفہ یہ ہے کہ غم نفسانی خواہشات کی وجہ سے، دنیا طلبی کی وجہ سے، سہولتوں کے حصول کے لیے، اور دوسروں سے برتری کے جذبہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ان چیزوں کو چھوڑ دو تو غم سے نجات مل جائے گی۔ ان چیزوں کو چھوڑنے کے لیے بڑی محنت کی ضرورت ہے، لہٰذا ریاضت اور قربانیوں کی ضرورت ہے۔ یہ ان کا صوفیانہ سا فلسفہ ہے، اس ذہنیت کے لوگ مہاتما بدھ کے ساتھ ملتے گئے اور ایک نیا مذہب وجود میں آ گیا جسے بدھ ازم کہتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ گوتم بدھ کے نام پر یہ دنیا سے کنارہ کش لوگوں کا گروہ تھا، ان کا زیادہ علاقہ انڈیا، جاپان، چین کا علاقہ، برما، سری لنکا رہا ہے۔

اشوکِ اعظم

۲۷۸ تا ۳۲۸ قبل مسیح ایک ہندو راجہ اشوک، جو اشوک اعظم کہلاتا ہے، اپنے ماحول سے تنگ آکر بدھ ہو گیا، جو اس پورے خطے کا فاتح تھا اور اپنے علاقے کا عادل حکمران سمجھا جاتا تھا۔ اشوک اعظم راجہ بندر ساکھ کا بیٹا تھا، اس کے باپ نے اس کو ٹیکسلا کا گورنر بنایا تھا۔ ٹیکسلا ایک زمانے میں بدھوں کا بہت بڑا تہذیبی اور علمی مرکز تھا۔ ٹیکسلا میں آثار قدیمہ کا مرکز، عجائب گھر اور بدھوں کی پرانی بین الاقوامی یونیورسٹی کے آثار میں نے دیکھے ہیں۔ سکندر اعظم نے لڑائی لڑ کر ٹیکسلا بدھوں سے لیا تھا۔ اشوک ٹیکسلا کا گورنر بنا اور باپ کی جگہ حکمران بنا۔ ان کی ایک بہت بڑی جنگ ہوئی تھی، کہا جاتا ہے کہ اس میں ایک لاکھ سے زیادہ آدمی قتل ہوئے تھے۔ اس سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا کیونکہ ان لوگوں کا رجحان لڑائی جھگڑے سے بچنے، ریاضت کرنے کا تھا۔ چنانچہ اشوک نے پھر ارد گرد پھیلاؤ شروع کیا۔ بدھوں کا پھیلاؤ اس زمانے میں پورے برصغیر کو محیط تھا۔ حتیٰ کہ افغانستان والے بدھ مذہب سے مسلمان ہوئے۔ راجہ اشوک اپنے زمانے کے بڑے حکمرانوں میں شمار ہوتا تھا، بڑا رعیت پرور آدمی تھا، اپنے فیصلوں کے لحاظ سے منصف مزاج اور لوگوں میں امن امان قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے قوانین وضع کیے اور دنیا کے عالمی عادل حکمرانوں میں شمار ہوتا ہے۔ مانسہرہ کی عالمی شاہراہ پر اشوک کے آثار اب بھی موجود ہیں۔

بدھ مت کی تعلیمات

بعض محققین کا کہنا ہے کہ ذکر اذکار اور اخلاقیات کے لحاظ سے بدھ مت کوئی آسمانی مذہب لگتا ہے۔ ذرائع ابلاغ آج کل تو اور طرح کے ہیں، اس زمانے میں بلند مقامات اور چٹانوں وغیرہ پر اپنے قوانین کندہ کروا دیے جاتے تھے۔ مانسہرہ میں آثار میں نے دیکھے ہیں، افغانستان میں بامیان کا بت بدھا کے بڑے بتوں میں سے تھا جو طالبان نے توڑا تھا۔ ایک بہت بڑی پہاڑی کو تراش کر مہاتما بدھ کا بت بنایا گیا تھا۔ جب طالبان نے اپنے دور حکومت میں اسے توڑا تو عالمی سطح پر اقوام متحدہ میں، دنیا میں اور جاپان میں کہرام مچ گیا تھا کیونکہ جاپان تو بدھوں ملک کا ہے اور انہوں نے اسے اپنی توہین سمجھا تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ جب طالبان نے بامیان کا بت توڑنے کا فیصلہ کیا تو جاپان نے پیشکش کی تھی کہ اس

کے عوض جو تم چاہو ہم دینے کو تیار ہیں یہ بت ہمارے حوالے کر دو۔ بہر حال یہ سارا علاقہ بنگال کے ساتھ بہار تک ان کی حکومت میں شامل تھا۔ یہ ان کے عروج کا زمانہ تھا۔

ان کے بنیادی عقائد میں ایک تو دنیا سے بے رغبتی کی تلقین شامل ہے، اب بھی ان کے مذہبی رہنما گیروی (زرد) رنگ کی دو چادریں باندھ رکھتے ہیں، اور اَن سلا کپڑا ہی پہنتے ہیں۔ ایک دفعہ لندن سے واپسی پر عمرہ کا ارادہ تھا، میں نے لندن ایئرپورٹ پر احرام باندھا ہوا تھا، کچھ بدھ مذہبی پیشوا اپنے اسی لباس میں تھے، میرے احرام اور ان کے لباس میں رنگ کا فرق تھا، وہ مجھے دیکھ کر بڑے خوش ہو رہے تھے اور شاید سمجھ رہے تھے کہ یہ بھی کوئی بدھ ہے۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھے اور خوشی کا اظہار کرنے لگے اور مجھ سے باتیں کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم ایک دوسرے کی زبان تو سمجھتے نہیں تھے، وہ مختلف زبانوں انگریزی وغیرہ میں مجھ سے بات کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ مجھے بدھ ہی سمجھ رہے ہیں۔ بدھ مذہب کے مذہبی پیشواؤں کا علامتی لباس احرام کی طرز کا لباس ہے۔

بدھوں کے بنیادی عقیدے کی باتوں میں دکھ سے نجات حاصل کرنا اور نروان حاصل کرنا ہے۔ یہ ہندوؤں کے عقیدہ تناسخ کے قائل نہیں ہیں، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ دنیا ہی ہے بس، اس میں اگر نروان حاصل کر لو گے تو روح کو نجات مل جائے گی، روح ہمیشہ رہے گی، جسم فنا ہو جائے گا، اس کے لیے اپنے آپ کو دنیا کی آلائشوں سے پاک کرنا ہوگا۔ ان کے ہاں سب سے زیادہ توجہ اخلاقیات اور ایک دوسرے کے ادب و احترام پر دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روہنگیا مسلمانوں کے ساتھ ان کا جھگڑا ہے، ان کے ظلم سے دنیا بھر کو تعجب ہوا کہ بدھا کے پیروکار یہ ظلم کر رہے ہیں، یہ تو جانور کو قتل کرنے کے قائل نہیں ہیں، انسانوں کو کیسے ذبح کر رہے ہیں؟ بہر حال۔

چند باتیں علماء کرام سے

ایک دفعہ بیجنگ یونیورسٹی کے دو پروفیسر دینی تعلیمی اداروں کا سروے کرتے ہوئے میرے پاس بھی آئے۔ بین الاقوامی طور پر سروے کرنے والوں کو تحقیقی ماحول چاہیے ہوتا ہے، ان کی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کے ساتھ کھلے ماحول میں ان کو معلومات فراہم کی جائیں۔ ہمارے لیے اس میں دو تین خطرے ہوتے ہیں:

۱. ایک تو یہ کہ یہ ریسرچ ہے اس کو صحیح معلومات نہ ملیں تو غلط ریسرچ کرے گا اور غلط معلومات

پہنچائے گا۔ اور چونکہ کسی بین الاقوامی یونیورسٹی کے پی ایچ ڈی کے درجہ کے مقالہ جات بطور حوالہ کے سند سمجھے جاتے ہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ اوریجنل معلومات فراہم کی جائیں۔

۲. اور دوسری طرف یہ خطرہ ہوتا ہے کہ اگر یہ کسی ایجنسی کا آدمی ہوا تو پھر کیا ہوگا؟ پھر تو ہماری معلومات ہم پر الٹ پڑ جائیں گی۔ کیونکہ بعض ایجنسیوں کے آدمی بھی ہوتے ہیں۔

۳. اور تیسرا یہ کہ وہ ریسرچ بھی کر رہا ہو اور جاسوسی بھی کر رہا ہو۔ کیونکہ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں، تینوں طرح کے لوگ دنیا میں گھومتے پھرتے ہیں۔

ہمارے علماء کرام اس تضاد کا ہدف اور شکار ہیں، میں اس کا متعدّد بار تجربہ کر چکا ہوں۔ میں واشنگٹن ڈی سی جاتا رہتا تھا، وہاں کچھ عرصہ رہتا، مختلف موضوعات پر مجالس ہوتی تھیں، گفتگو ہوتی تھی۔ ایک دفعہ کچھ لوگ مجھ سے ملنے آئے، ان کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ اپنے طور پر نہیں آئے بلکہ بھیجے گئے ہیں۔ میں عموماً یہ بات کہہ دیتا ہوں اور ان سے بھی کہا کہ سیدھی بات کرو کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟ اور میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ اگر واقعی ریسرچ کی دنیا کے لوگ ہیں تو ان کو اصل معلومات فراہم کی جائیں تاکہ ان کی رپورٹ صحیح معلومات پر ہو۔ وہ انڈیا اور بنگلہ دیش کے لوگ تھے اور اردو بولتے تھے۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا ہم اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے لوگ ہیں، سرکاری اداروں کے لوگ ہیں، برصغیر کے دینی مدارس کے بارے میں ریسرچ کر رہے ہیں، یہ ہمارے تھنک ٹینک کا موضوع ہے۔ ہم الجھن میں ہیں کہ ہم جہاں بھی جاتے ہیں جس سے بھی بات کرتے ہیں وہ ہم سے گول مول بات کرتا ہے، صحیح صورتحال ہمیں نہیں بتائی جاتی۔ اس مشکل کا حل کیا ہے؟ میں نے کہا بات کرو کیا چاہتے ہو۔

انہوں نے کہا آج کل مدارس کے نصاب و نظام کے حوالے سے جو صورتحال ہے، ہم اس سے واقفیت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا میں آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں، صحیح بات آپ کو بتاؤں گا، بحث بھی کروں گا، سوالات کا جواب بھی دوں گا، خوبیاں بھی بتاؤں گا، خامیاں بھی کہ میں تو اسی شعبے کا آدمی ہوں۔ انہوں نے کہا ہم آپ کی بات پالیسی ساز لوگوں سے کروانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا میں تیار ہوں لیکن زبان کا مسئلہ ہے، اگر میری مرضی کا ترجمان مل جائے، وہاں اس سطح پر بات کرنے کے لیے میں

ترجمان اپنی مرضی کا مانگتا ہوں تاکہ وہ وہی بات کرے جو میں کہہ رہا ہوں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔ لیکن اس کے بعد ٹائم سیٹ نہ ہو سکا، میں نے واپس آنا تھا اور پھر کئی سال سے میں وہاں جا نہیں سکا۔

درمیان میں علماء کرام سے یہ بات کہہ دوں کہ چائنہ آنے والے وقت کے لیے اپنا ہوم ورک بڑی گہرائی میں اور بڑی تیزی سے مکمل کر رہا ہے۔ ''سی پیک'' کی تکمیل کے بعد اس خطے کے سیاسی، تہذیبی اور مذہبی ماحول کا آنے والا دور تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر جو مجھے نظر آ رہا ہے اس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی جھلک دکھائی دے رہی ہے۔ وہ بھی تجارت کے نام سے ہی آئی تھی۔ میں سر دست اتنی ہی بات کہوں گا۔ میں مجالس میں اس کا اظہار کر رہا ہوں کہ شاید کچھ ہونے والا ہے اور لوگوں کو یہ محسوس بھی ہو رہا ہے۔

مجھے اسلام آباد کے کچھ دوستوں نے کہا کہ چین سے دو پروفیسر پاکستان کے دینی مدارس کا جائزہ لینے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ وہ دینی حلقے کے کسی ایسے عالم سے ملنا چاہتے ہیں جو صحیح صورتحال سے واقفیت رکھتا ہو اور بریف کر سکے۔ اس حوالے سے بھی کہ آپ اندر کے آدمی ہیں آپ کو سب کچھ پتہ ہے، اور اس حوالے سے بھی کہ ان کو مہمان کے طور پر جس طرح ٹریٹ کرنا چاہیے ہمیں اعتماد ہے کہ آپ ان کے وقار اور حیثیت کے مطابق ان کے لیول کا لحاظ رکھیں گے۔ کیونکہ ہمارے ہاں عموماً یہ ہوتا ہے کہ جس سے ہم بات کر رہے ہیں وہ اگر ہمارے خیال میں ہمارے لیول کا نہیں ہے تو ہمارے لہجے میں اس کی تحقیر، استہزا، توہین اور اپنی برتری ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ ڈائیلاگ کے اصولوں کے خلاف ہے۔ اگر بات کرنے والا علمی سطح کا آدمی ہے تو اس کے مطابق اس سے بات کرنی چاہیے۔ چنانچہ وہ میرے پاس آئے، دو تین گھنٹے بات ہوئی، میں نے ان کو معلومات دیں۔

میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان میں سے ایک بدھ تھا جبکہ دوسرے نے بتایا اس کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ میں نے بدھ سے سوال کیا کہ آپ نے کمیونزم کے آنے کے بعد بدھ مذہب چھوڑ نہیں دیا؟ وہ کہنے لگا، ہم نے معاشرت میں ایک نیا پہلو اختیار کیا ہے، مذہب تو نہیں چھوڑا۔ ہمارے عقائد، عبادات، رسومات وہی چل رہی ہیں، ہم بدھ ہی ہیں، جس طرح مسلمانوں میں مذہب کے رجحانات بڑھ رہے ہیں، وہاں بدھ مذہب کے بھی بڑھ رہے ہیں۔ چائنہ میں آنے والے دور میں بدھ ازم کے آثار نمایاں ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔

جس طرح وسطی ہند ہندو مذہب سے مسلمان ہوا ہے، اس طرح شمالی ہند کا علاقہ (خیبر پختونخوا، ڈیرہ اسماعیل خان، بنوں، مانسہرہ، کشمیر، گلگت، افغانستان سمیت) بدھ مذہب سے مسلمان ہوا ہے۔ اس خطے کا اسلام سے پچھلا مذہب بدھ ازم تھا، یہاں راجہ اشوک کی حکمرانی رہی ہے۔ آج کے دور کا بدھ مذہب پہلے والا نہیں رہا، بالخصوص برما کا بدھ مذہب مسلمانوں کے مقابلے پر کھڑا ہے، میں اس کا تھوڑا سا تذکرہ کرنا چاہوں گا کہ اراکان (روہنگیا) کا مسئلہ کیا ہے؟

اراکان (برما/میانمار) کے روہنگیا مسلمانوں کا مسئلہ

بنگلہ دیش اور برما کے درمیان ایک ساحلی پٹی ہے اراکان کی، جو کہ چاٹگام کے ساتھ پہاڑی علاقہ ہے۔ چاٹگام بھی ایک زمانے میں اراکان کا حصہ تھا۔ ارکان میں ایک زمانے میں، انگریزوں کے آنے سے بہت پہلے مسلمانوں کی تقریباً تین صدیاں اپنی خود مختار حکومت رہی ہے۔ یہ ایک آزاد ریاست تھی، چاٹگام اس کا مرکز تھا۔ نہ یہ بنگال کا حصہ تھا نہ برما کا تھا۔ وہاں کی عمومی نسل روہنگیا ہے، نوے فیصد مسلمان ہیں۔ چاٹگام بنگلہ دیش کی بڑی بندر گاہ ہے اور متحدہ پاکستان کے دور میں کراچی کے بعد پاکستان کی دوسری بڑی بندر گاہ تھی۔ مغلوں کے دور میں برما کے بدھ حکمرانوں نے اراکان پر قبضہ کر لیا۔ پھر جب انگریز آئے تو انہوں نے بنگلہ دیش اور برما کے ساتھ اراکان پر بھی قبضہ کر لیا۔ اراکان کی اس وقت ایک کروڑ کے قریب آبادی ہوگی۔

برصغیر کو آزادی دینے سے پہلے انگریزوں نے

- جس طرح سندھ تقسیم کر کے بمبئی الگ کر دیا تھا،
- مشرقی اور مغربی بنگال تقسیم کر کے الگ الگ کر دیے تھے،
- اسی طرح برما کو آزادی دی تو چاٹگام کو بنگلہ دیش کے ساتھ شامل کر دیا، باقی اراکان کو برما کے حوالے کر دیا۔

برما پاکستان سے پہلے آزاد ہوا اور اس پٹی میں مسلم اکثریت تھی۔ بدھوں نے آہستہ آہستہ اس پٹی میں مسلم اکثریت کو ختم کرنے کے لیے پانچ سات فوجی آپریشن کیے۔ آخری آپریشن ابھی پچھلے سال کیا جو بڑا خطرناک آپریشن تھا۔ ٹارگٹ یہ ہے کہ مسلم اکثریت ختم ہو۔ اس کا معاملہ بھی کشمیر جیسا ہے کہ وہاں مسلم اکثریت ہے لیکن بھارت اسے اپنا حصہ سمجھتا ہے۔

جب پاکستان آزاد ہونے لگا تو اراکان کے مسلمانوں کو برما کی اسمبلی میں نمائندگی حاصل تھی۔ یہ ایک مستقل صوبہ تھا، انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا اور ان کا ایک وفد قائداعظم محمد علی جناح مرحوم سے ملا کہ ہم بھی آپ کے ساتھ ہی ہیں۔ وہ اس وقت کے متحدہ پاکستان کے ساتھ ہی تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپ ہمیں اپنے ساتھ شامل کریں اور ہمارے لیے بھی آواز اٹھائیں کہ پاکستان کے ساتھ ملحقہ مسلم اکثریت کی پٹی اراکان کی ہے، ہم برما میں نہیں رہنا چاہتے، بنگال (مشرقی پاکستان) میں رہنا چاہتے ہیں۔ قائداعظم نے شاید کسی مصلحت کی بنا پر ان کی بات نہیں مانی۔

اس وقت سے لے کر اب تک روہنگیا مسلمان، اراکانی مسلمان تشدد کا شکار ہو رہے ہیں۔ ان کے برمی فوج کے ذریعے چار یا پانچ آپریشن ہو چکے ہیں ہر دفعہ ہزاروں لاکھوں کو مار کر نکال دیا جاتا ہے۔ وہ ان کو نکالتے ہیں تو درمیان میں سمندر ہے دوسری طرف بنگال ہے۔ پچھلے دو آپریشنز میں بڑا ظلم یہ ہوا کہ بنگلہ دیش نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا، سینکڑوں نہیں ہزاروں لوگ سمندر میں ڈوب گئے، کچھ کو تھائی لینڈ نے قبول کیا۔ ابھی تک یہ مسئلہ چل رہا ہے، اس پر بین الاقوامی سطح پر آواز اٹھائی گئی ہے۔ اقوام متحدہ نے بھی زبانی جمع خرچ کے طور پر آواز اٹھائی ہے۔ اور اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) نے بھی رسمی طور پر کچھ حصہ لیا ہے لیکن جو کرنا چاہیے تھا وہ نہیں کیا۔ اراکان کے نمائندے یہاں آئے، اب بھی کراچی میں بیٹھے ہوئے ہیں، میں نے انہیں مختلف شخصیات حضرت مولانا فضل الرحمٰن اور راجہ محمد ظفر الحق وغیرہ حضرات سے ملوایا اور کہا کہ ان کے مسئلے کو اٹھانے کی ضرورت ہے۔ آواز اٹھائی جاتی ہے، کچھ مدد ہو جاتی ہے، اس کے علاوہ ہم بھی کچھ نہیں کر پاتے۔

یہ میں برما بدھ حکومت کے ساتھ مسلمانوں کے ٹکراؤ کی بات کر رہا ہوں۔ اس وقت ہمیں بدھوں کے ساتھ جو سب سے بڑا مسئلہ در پیش ہے وہ اراکان کا مسئلہ ہے۔ مجھے دو باتیں نہیں بھولتیں:

- دنیا میں گھومنے پھرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے، ہم ناقدرے لوگ ہیں۔ جس زمانے میں بوسنیا (مشرقی یورپ) میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہو رہا تھا، بوسنیا کے مسلمان پکار رہے تھے کہ ہمارا ساتھ دو۔ اس وقت بوسنیا کے صدر الحاج عزت بیگوج دنیا میں گھوم پھر رہے تھے، انہیں لندن میں مسلمانوں کی طرف سے استقبالیہ دیا گیا کہ ان سے ان کے مسئلے کی صورتحال معلوم کی جائے اور ان کی سپورٹ کی جائے۔

اتفاق سے مولانا شاہ احمد نورانیؒ وہاں تھے، ہم دونوں شریک ہوئے۔ مولانا نورانیؒ نے استقبالیہ پیش کیا۔ عزت بیگوج نے اپنی باتوں میں یہ کہا کہ ہماری اصل بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے پڑوس میں کوئی پاکستان نہیں ہے۔ یہ اس نے آہ بھر کر کہا کہ اگر ہمارے پڑوس میں کوئی پاکستان ہوتا تو ہم اس حشر کا شکار نہ ہوتے۔

- روہنگیا مسلمانوں کے خلاف پچھلے آپریشن میں ہم نے دو چار سیمینار کیے اور پارلیمنٹ میں بھی آواز اٹھائی گئی تو لاہور میں ہم نے ان کے ایک نمائندہ بزرگ کو استقبالیہ دیا، انہوں نے بھی بعینہٖ یہی بات کہی کہ ہمارا مسئلہ کشمیر سے مختلف نہیں ہے لیکن ہمارے پڑوس میں پاکستان نہیں ہے۔

یہ میں نے بدھ مذہب کا ہلکا سا تعارفی خاکہ آپ کے سامنے رکھا ہے۔ یہ سب سے قدیم مذہب ہے پانچ سو سال قبل مسیح شروع ہوا تھا، بنیادی طور پر اخلاقیات اور روحانیات کا مذہب ہے، قتل و قتال سے گریز سب سے زیادہ ان کی تعلیمات میں ملتا ہے۔ لیکن اس وقت جس بے رحمی کے ساتھ قتل و قتال بدھ حکمران روہنگیا مسلمانوں پر کر رہے ہیں اس کی مثال نہیں ملتی، مجھ سے وہ مناظر دیکھنے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ بہرحال بدھ مذہب دنیا کے زندہ مذاہب میں سے ہے، ان مذاہب میں سے ہے جن کے ساتھ ہمیں معاملات درپیش ہیں۔ دنیا کی اچھی خاصی آبادی اور اچھا خاصا علاقہ اس مذہب سے متعلق ہے۔ برما میں اس وقت کی ان کی حکمران آنگ سان سوچی ہے، جو ایک زمانے میں دنیا میں انسانی حقوق کی بڑی علمبردار سمجھی جاتی تھی، اس کو انسانی حقوق پر عالمی میڈل بھی ملا، بہت سے مغربی ممالک نے اسے تمغے دیے تھے، لیکن یہاں آ کر اس کی حقیقت بھی سامنے آ گئی کہ وہ مسلمانوں پر ہونے والے ظلم کو ظلم کہنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس پر بہت سے مغربی ممالک نے اس سے تمغے واپس لے لیے۔

آج میں نے بدھ مذہب کے تعارف، تاریخ، ہمارے ساتھ ماضی اور حال کے درپیش معاملات، اور مستقبل کے امکانات کے حوالے سے کچھ بات کی ہے۔ یہودی، عیسائی، سکھ، اور ہندو مذاہب پر بھی بات ہو چکی ہے۔ یہ وہ مستقل مذاہب ہیں جن کے ساتھ آج ہمیں معاملات پیش ہیں۔ اس کے بعد کچھ منحرف مذاہب پر بات ہوگی۔ ادیانِ معاصرہ پر بات ہو چکی ہے، اب منحرف مذاہب کا تذکرہ ہو

گا، اس کے بعد اہلِ قبلہ کے اندر باطل مذاہب کی تقسیم ہے، اور پھر اہلِ حق کے اندر کے دائرے ہیں۔ یہ چار دائرے میں بتایا کرتا ہوں۔

منحرف مذاہب سے میری مراد وہ گروہ ہیں جنہوں نے ختمِ نبوت سے انکار کر کے اپنے مذہب کی بنیاد نئی نبوت اور نئی وحی پر رکھی لیکن نام اسلام کا استعمال کرتے ہیں۔ آئندہ نشست سے ان کا تعارف ہو گا کہ اسلام کے ٹائٹل کے ساتھ نئی نبوت اور نئی وحی کے دعویدار گروہ دنیا میں کون کون سے ہیں؟ بہائی، نیشن آف اسلام، قادیانی، ذکری، اور امریکہ میں خلیفہ رشاد کا گروپ۔ یہ سب نئی نبوت کے قائل ہیں اور نام اسلام کا استعمال کرتے ہیں۔

دورِ اول کے مدعیانِ نبوت

منحرف مذاہب

بعد الحمد والصلوٰۃ- حضرات علماء کرام! آج منحرف مذاہب کے حوالے سے بات کریں گے۔ منحرف مذاہب سے مراد وہ مذاہب ہیں جو نام اسلام کا لیتے ہیں لیکن نئی نبوت اور نئی وحی کے قائل ہیں۔ میں نے ان کو منحرف مذاہب کا عنوان صرف فرق بتانے کے لیے دے رکھا ہے ورنہ تو یہ غیر مسلموں میں ہی ہیں۔ یہ اس وقت کون کون سے ہیں؟

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور آپؐ کے بعد اب تک بہت سے لوگوں نے مختلف ادوار میں مختلف علاقوں میں نبوت اور نئی وحی کا دعویٰ کیا۔ آنحضرتؐ نے اپنی امت میں تیس مدعیانِ نبوت کی پیشینگوئی بھی فرمائی تھی۔ "سیکون فی امتی" میری امت کہلانے والے۔ "ثلاثون کذابون دجالون" اور ایک روایت میں "سبعون کذابون دجالون" بھی ہے کہ نبوت کے ستر دعویدار پیدا ہوں گے۔ "یزعم انہ نبی" دعویٰ یہ کریں گے کہ ہم اللہ کے نبی ہیں، جبکہ میں ہی آخری نبی ہوں۔

پہلے میں ان کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ میں مدعیانِ نبوت تھے۔ یہ کون کون تھے اور ان کا دعویٰ کیا تھا اور حضورؐ اور صحابہؓ کا ان کے ساتھ طرزِ عمل کیا تھا؟ وہاں سے ہمیں رہنمائی ملتی ہے کہ اگر کسی مسلم سوسائٹی میں کوئی نبوت اور وحی کا دعویٰ کرے تو مسلم سوسائٹی کا اس کے بارے میں کیا طرزِ عمل ہونا چاہیے۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں تین شخصوں نے نبوت کا دعویٰ کیا، مسیلمہ، طلیحہ اور اسود عنسی۔ چوتھی ایک خاتون ہے سجاح، جس نے آپؐ کی وفات کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا۔

مسیلمہ

مسیلمہ یمن حجاز کے علاقے کا تھا، بنو حنیفہ قبیلے کا سردار تھا، اسے اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا ناز تھا، اس کی قوم بھی اس کے ساتھ تھی۔ جناب نبی کریمؐ کی نبوت، وحی اور دین کا دائرہ پھیلتے دیکھ کر اسے شوق آیا کہ میں بھی ایک علاقے کا بڑا آدمی ہوں، اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا اور ''الفاروق'' کے نام سے وحی کا مجموعہ بھی بنایا، اس کی بہت سی آیات نشانی اور علامت کے طور پر مختلف مفسرین نے نقل کی ہیں۔ لیکن ایک بات جو عام طور پر ہم نظر انداز کر جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ مسیلمہ نے آپؐ کے زمانے میں نبوت کا دعویٰ آپؐ کے مقابلے پر نہیں کیا بلکہ حضورؐ کی تابعداری کے دعوے کے ساتھ کیا۔ وہ پہلے آنحضرتؐ کی رسالت کا اقرار کرواتا تھا اور پھر اپنی نبوت و رسالت کی بات کرتا تھا۔ وہ آپؐ کی نبوت کی نفی کر کے نبوت کا مدعی نہیں تھا۔ احادیث میں اس کے بہت سے قرائن موجود ہیں۔

پہلے شہیدِ ختمِ نبوت حبیب بن زید انصاریؓ جنہوں نے مسیلمہ کذاب کے ہاتھوں شہادت پائی، ان کو جب مسیلمہ کے سامنے پیش کیا گیا تو مسیلمہ نے ان سے جو سوال کیے ان میں پہلا سوال تھا ''اتشهد ان محمدًا رسول الله؟''۔ فرمایا ''اشهد ان محمدًا رسول الله''۔ پھر سوال کیا ''اتشهد انی رسول الله؟'' فرمایا، نہیں۔ اس پر اس نے آپؓ کو شہید کیا۔

بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے وہ خط مذکور ہے جو مسیلمہ نے آپؐ کو لکھا تھا، اس خط کا عنوان تھا ''من مسيلمة رسول الله الى محمد رسول الله'' مسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کے نام۔ آگے خط کا مضمون یہ تھا ''اشركت معك فى الامر ولٰكن قريشا قوما يعتدون'' مجھے نبوت کے معاملے میں آپ کے ساتھ شریک کیا گیا ہے لیکن قریش بڑے ظالم لوگ ہیں کسی کا حق تسلیم نہیں کرتے۔ یعنی اس کا دعویٰ شریک نبی کا تھا، حضورؐ کی نبوت کے ساتھ شراکت کا تھا۔

اس کے سفیر جو اس کا خط لے کر آپؐ کی خدمت میں آئے تھے، ان سے جناب نبی کریمؐ نے پوچھا ''اتشهد ان انی رسول الله؟'' تم گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ تو انہوں نے کہا ''نشهد

انک رسول اللہ'' ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ پھر آپؐ نے ان سے پوچھا ''اتشھد ان مسیلمۃ رسول اللہ؟'' کیا تم مسیلمہ کو بھی اللہ کا رسول مانتے ہو؟ انہوں نے کہا ''نعم نشھد ان مسیلمۃ رسول اللہ'' ہم مسیلمہ کو بھی اللہ کا رسول مانتے ہیں۔ حضورؐ نے ان کے جواب میں ایک جملہ ارشاد فرمایا، وہی ہمارے دینی ردعمل اور دینی فیصلے کی بنیاد ہے۔ فرمایا ''لولا ان الرسل لا تقتل لضربتا عناقکما'' اگر یہ قاعدہ قانون نہ ہوتا کہ سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تم دونوں کی گردنیں اڑا دیتا کہ مجھے رسول ماننے کے بعد کسی اور کو اللہ کا رسول ماننا، یہ تو ارتداد ہے اور ارتداد کی سزا قتل ہے۔ لیکن چونکہ بین الاقوامی ضابطہ ہے کہ قاصد کو قتل نہیں کیا جاتا اس لیے میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں۔

اس پر السنن الکبریٰ میں امام بیہقیؒ نے حضرت عثمانؓ کے زمانے کا واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کوفہ میں منصبِ قضا پر فائز تھے، ایک دن آپؓ کوفہ کے بازار میں جا رہے تھے کہ ایک شخص پر نظر پڑی۔ شک پڑنے پر اسے بلوایا اور فرمایا تجھے کہیں دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مسیلمہ کا خط لے کر جو دو آدمی حضورؐ کی خدمت میں آئے تھے، ان میں ایک تم تھے۔ اس کا نام ابن نواحہ تھا۔ اس نے کہا، ہاں ان دو میں سے ایک میں تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے پوچھا کیا اب بھی مسیلمہ کو اللہ کا رسول مانتے ہو؟ اس نے کہا کہ جی مانتا ہوں۔ آپؓ نے پوچھا اب تم کسی قوم کے سفیر تو نہیں ہو؟ اس نے کہا نہیں۔ اس پر اسے گرفتار کر لیا اور ضابطے کے مطابق تین دن کی مہلت دی، تین دن تک اس نے توبہ نہ کی تو عبداللہ بن مسعودؓ نے اسے قتل کرا دیا اور اس کی لاش کوفہ کے بازار میں لٹکا دی کہ حضورؐ کے بعد کسی کو نبی ماننے والے کی سزا یہ ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیلمہ کی نبوت کو ماننے والے حضورؐ کی نبوت کو بھی مانتے تھے۔ اور بھی شواہد ہیں جو میں ابھی نظر انداز کر رہا ہوں۔ چنانچہ مسیلمہ نے خط میں تقاضا بھی یہی کیا کہ اگر آپ مجھے اپنے ساتھ شریک نہیں مانتے تو پھر آپ مجھے اپنا جانشین نامزد کر دیں، یا پھر تقسیم کر لیجیے ''لنا وبر ولک مدر'' شہری حلقے آپ کے اور دیہاتی حلقے میرے۔ یعنی شہروں کے نبی آپ ہوں گے اور دیہاتوں کی نبوت میرے سپرد کر دیں۔

مسیلمہ ایک دفعہ خود جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں بہت بڑا جرگہ لے کر آیا، رسول اللہ سے اس کی ملاقات ہوئی۔ آپؐ اس سے ملاقات کے لیے جب تشریف لے گئے تو اپنے ساتھ ثابت بن قیس بن شماسؓ کو لے کر گئے جو خطیب الانصار، خطیب رسول اللہ کے القاب سے ملقب تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ مسیلمہ کا بڑا زعم خطابت کا تھا، اور مذاکرات بھی انہی کے حوالے کیے۔ مسیلمہ کی پیشکش کے جواب میں دو جملے فرمائے کہ "ان الارض للّٰہ یورثھا من یشاء من عبادہ" (الاعراف ۱۲۸)۔ خلافت دینا، شہر دیہات تقسیم کرنا میرا کام نہیں، یہ اللہ کا کام ہے، وہ جس کو چاہے خلافت دے گا، جسے چاہے گا شہر دے گا، جسے چاہے گا دیہات دے گا، یہ اللہ کا کام ہے، اس میں مجھے کوئی اختیار نہیں ہے۔ اور تم ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکو گے، اگر تم نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اللہ تمہاری جڑ کاٹ دے گا۔ اس کے بعد فرمایا، میں اپنا نمائندہ ثابت بن قیسؓ چھوڑ کر جا رہا ہوں اب تم جانو اور یہ جانے، باقی مذاکرات اس سے کر لو۔

میں نے اس سے یہ بات واضح کی ہے کہ مسیلمہ کا دعویٰ آپ کی نبوت کو مانتے ہوئے آپ کے ساتھ کارِ نبوت میں شراکت کا تھا۔ جیسا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ ہے۔ حضورؐ کے زمانے میں مسیلمہ مقابلے پر نہیں آیا، دورِ صدیقی میں چونکہ اس کا مطالبہ خلافت کا بھی تھا، وہ مقابلے پر آیا اور پھر جو ہوا تفصیلات آپ کے علم میں ہیں۔

طلیحہ اسدی

طلیحہ بن خویلد اسدی، بنو اسد قبیلے کا تھا۔ بنو اسد خیبر کے علاقے کا قبیلہ تھا۔ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا، دعویٰ کر کے لشکر اکٹھا کیا اور بغاوت کر دی۔ جناب نبی کریمؐ نے معروف کمانڈر ضرار بن ازورؓ کو حکم دیا کہ طلیحہ سے جا کر نمٹو۔ یہ گئے اس سے مقابلہ ہوا، طلیحہ شکست کھا کر بھاگ گیا اور بھاگا رہا۔ جب وصالِ نبویؐ کے بعد مسیلمہ اور مرتدین کے ساتھ جنگیں ہوئیں تو پھر اپنے علاقے میں آیا اور لشکر اکٹھا کر کے مقابلے پر آ گیا۔ پہلی جنگ میں معروف صحابی عکاشہ بن محصن فزاری اسدیؓ، جو بڑے

کڑیل خوبصورت نوجوان تھے اور طلیحہ کے کزن تھے، ان کا اور طلیحہ کا آمنا سامنا ہوا تو طلیحہ کے ہاتھوں حضرت عکاشہؓ شہید ہو گئے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ مسیلمہ کذاب کے لشکر کو شکست دے کر واپس تشریف لا رہے تھے تو حضرت صدیق اکبرؓ نے ان کو حکم دیا کہ راستے میں طلیحہ کا قضیہ بھی نمٹاتے آؤ۔ پھر طلیحہ کا مقابلہ حضرت خالد بن ولیدؓ کے ساتھ ہوا، اس میں پھر شکست کھائی، بھاگ گیا اور روپوش ہو گیا۔

ابن عساکر نے تاریخِ دمشق میں تفصیل سے یہ واقعہ ذکر کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں طلیحہ نمودار ہوا لیکن نبوت کے دعوے پر نہیں بلکہ نبوت سے توبہ کر لی۔ اب یہ اس تلاش میں تھا کہ حضرت عمرؓ کے سامنے کوئی ذمہ دار آدمی سفارشی بن کر میرے ساتھ چلے تو میں جا کر توبہ کر لوں، وہ میری بات سنے بغیر ہی کوئی فیصلہ نہ فرما دیں۔ یہ آج کل بھی ہوتا ہے کہ کوئی بڑا مجرم ہو تو سرنڈر ہونے سے پہلے کسی کو درمیان میں ضامن بناتا ہے، تھانے میں پیش ہونے کے لیے بھی، تاکہ پتہ ہو کہ یہ پیش ہوا ہے، ویسے ہی کہیں ''پار'' نہ ہو جائے۔ بہرحال کسی نے اسے بتایا کہ حضرت خالد بن ولیدؓ اس علاقے میں آئے ہوئے ہیں ان سے مل لو۔ اس نے کہا نہیں! اس کے پاس نہیں جانا وہ تو مجھے مار دے گا، کوئی اور آدمی بتاؤ۔ لوگوں نے بتایا کہ حضرت عمرو بن العاصؓ ہیں۔ اس نے کہا، ہاں وہ ٹھیک ہیں۔

حضرت عمرو بن العاصؓ میں اللہ تعالیٰ نے تینوں صلاحیتیں رکھی تھیں کہ (۱) جنگ کے آدمی بھی تھے (۲) میز کے آدمی بھی تھے (۳) اور ایڈمنسٹریٹر بھی تھے۔ حالانکہ اعلیٰ سطح پر یہ تینوں صلاحیتیں بہت کم اکٹھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ طلیحہ حضرت عمرو بن العاصؓ کے پاس آیا اور کہا میں توبہ کرنا چاہتا ہوں اور امیر المؤمنین کے سامنے پیش ہونا چاہتا ہوں، آپ مجھے گارنٹی کے ساتھ حضرت عمرؓ سے ملوا دیں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔ پھر مدینہ میں حضرت عمرؓ کے سامنے اسے پیش کیا، اس نے اپنا تعارف کرایا کہ میں طلیحہ ہوں۔ فرمایا، میں نے پہچان لیا ہے۔ کیسے آئے ہو؟ اس نے کہا ایمان قبول کرنے آیا ہوں، توبہ کرتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، توبہ تو تم کر لو گے لیکن میں عکاشہؓ کا کیا کروں گا، مجھے وہ نہیں بھولتا جو تمہارے ہاتھوں جنگ میں مارا گیا۔ طلیحہ بڑا ذہین آدمی تھا،

۱. اس نے جواب دیا، حضرت! کیا آپ اس بات پر خوش نہیں ہیں کہ اللہ رب العزت نے اس کو میرے ہاتھوں جنت میں پہنچا دیا اور مجھے اس کے ہاتھوں جہنم میں نہ جانے دیا۔

۲. دوسری بات اس نے یہ کی کہ حضرت! کیا کل قیامت کے دن آپ کو یہ منظر اچھا نہیں لگے گا کہ میں اور عکاشہ قاتل و مقتول دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے جنت میں جارہے ہوں گے۔

اس کی یہ باتیں سن کر حضرت عمرؓ مسکرائے اور فرمایا، ٹھیک ہے کلمہ پڑھو۔ اس نے کلمہ پڑھا، توبہ کی، ایمان قبول کیا، ایک صالح مسلمان کی حیثیت سے باقی زندگی گزاری، اور ایران کی کسی جنگ میں شہید ہوگئے۔ صحابہ کرامؓ کا تذکرہ کرنے والے محدثین حافظ ابن حجر، ابن عبد البر، ابن الاثیر وغیرہ نے طلیحہؓ کا ذکر صحابہؓ میں اور شہداء میں کیا ہے۔

اسود عنسی

تیسرے مدعی نبوت اسود عنسی کا تعلق یمن سے تھا۔ یمن کا علاقہ لڑائی سے فتح نہیں ہوا تھا، اکثر قبائل خود حاضر ہو کر مسلمان ہوگئے تھے۔ آپؐ نے یمن کے ایک حصے کا گورنر حضرت معاذ بن جبلؓ اور ایک حصے کا گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو مقرر فرما دیا۔ محصولات کی وصولی کے لیے حضرت علیؓ کو بھیجا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ بھی بعض علاقوں میں گئے، یہ سب حضرات مختلف ڈیوٹیوں پر یمن میں تھے، پورا یمن آپؐ کی حیاتِ مبارکہ میں اسلامی سلطنت میں شامل ہو گیا تھا۔ لیکن صنعاء کے ایک سردار عیہلہ یا عبہلہ، جس کا رنگ کالا ہونے کی وجہ سے اسود کہلاتا تھا، نے بغاوت کر دی، اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا، وہ شعبدے بھی دکھایا کرتا تھا، اس کو بھی اپنی خطابت پر ناز تھا۔ اس نے آپؐ کے صنعاء پر مقرر کردہ گورنر شہر بن بازانؓ کو شہید کر دیا، شاہی محل پر قبضہ کر لیا اور اعلان کر دیا کہ یمن کا دارالحکومت میرے قبضہ میں ہے۔

بعض روایات کے مطابق حضورؐ کے چند عمّال یمن سے نکل کر نجران میں آ گئے تھے۔ رسول اللہ کی بیماری کا آغاز ہو چکا تھا، آپؐ کے آخری ایام تھے، آپؐ کو خبر ملی کہ اسود نے صنعاء کے علاقے میں نبوت کا دعویٰ کیا ہے، تو آپؐ نے مجلس میں ذکر کیا کہ کون ہے جو اس کو سنبھالے گا؟ تو یمن کے علاقے سے تعلق رکھنے والے اسود کے قبیلے کے صحابی حضرت فیروز دیلمیؓ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضورؐ کی اجازت سے یمن جا کر ایک جتھہ بنایا، ان سے آمنے سامنے جنگ نہیں کی بلکہ چھاپہ

مار کارروائی کی۔ پہلے اہلِ خانہ سے ساز باز کی، سابقہ گورنر کی بیوی جس کا نام آزاد بتاتے ہیں، اسود عنسی نے چھین کر اس کو اپنی باندی بنا لیا تھا جو کہ فیروز دیلمیؓ کی چچازاد تھی، اس سے رابطہ کیا، پلاننگ کر کے رات کو اسے شراب پلائی، جب اس کو نشہ آیا تو قتل کر دیا اور صبح ہوتے ہی محل کی چھت پر چڑھ کر جھنڈا لہرا دیا کہ میں فیروز ہوں میں نے اسود قتل کر دیا ہے اور ہم نے قلعے پر قبضہ کر لیا ہے، سارے واپس آجاؤ۔

اس طرح دوبارہ یمن پر مسلمانوں کا اقتدار بحال ہو گیا۔ اس کے بعد جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں خبر بھجوائی لیکن خبر لانے والا قاصد آپؐ کے وصال کے دو دن بعد پہنچا۔ البتہ جناب نبی کریمؐ کو وحی کے ذریعے اسی وقت اطلاع مل گئی تھی۔ حضورؐ نے وصال سے دو دن پہلے بستر علالت پر فرمایا ”فاز فیروز، فاز فیروز“۔ فیروز اپنے مشن میں کامیاب ہو گیا، فیروز نے اپنا ٹارگٹ پا لیا۔ جب حضورؐ نے یہ فرمایا تو بہت سے لوگ نہ سمجھ سکے کہ اس فیروز سے کون مراد ہے اور وہ کیسے کامیاب ہوا۔ ان کو تب پتہ چلا جب حضرت فیروز دیلمیؓ آپؐ کی وفات کے چند دن بعد مدینہ پہنچے۔ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کو خبر پہنچائی، اس سے لوگوں کو علم ہوا کہ حضورؐ نے جو فرمایا تھا اس کا مطلب کیا تھا۔

سجاح

چوتھی مدعی نبوت سجاح کا تعلق بنو تغلب سے تھا، وہ بھی بڑی فصیح خطیبہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ چالیس ہزار کا لشکر اس نے اکٹھا کر لیا تھا۔ اس زمانے میں قبائلی سسٹم تھا، قبائل ساتھ دیا کرتے تھے۔ جب یہ یمامہ کے قریب پہنچی تو لوگوں نے اسے کہا تم اور مسیلمہ الگ الگ لڑنے کی بجائے اکٹھے کیوں نہیں ہو جاتے؟ آپس میں صلح کر لو اور اکٹھے حملہ کرو تو تم مدینہ والوں کو شکست دے سکتے ہو۔ اس سلسلہ میں دونوں گروپوں کے درمیان صلح کے لیے مذاکرات کا اہتمام کیا گیا۔ سجاح مذاکرات کے لیے مسیلمہ کے خیمے میں گئی اور اس میں سے تین دن کے بعد باہر نکلی اور کہا کہ ہماری صلح ہو گئی ہے، ہم نے آپس میں نکاح کر لیا ہے۔ قوم والوں نے پوچھا، مہر کیا مقرر کیا ہے؟ کہنے لگی یہ تو میں بھول گئی تھی، دوبارہ جا

کر پوچھتی ہوں۔ اس نے کہا، مہر یہ ہے کہ تمہاری نمازیں معاف ہیں۔ مسیلمہ اور سجاح کا مجموعی لشکر اَسی ہزار بتایا جاتا ہے۔

مسلمانوں کا پہلا لشکر حضرت عکرمہؓ بن ابی جہل کی قیادت میں گیا، اس نے شکست کھائی اور حضرت صدیق اکبرؓ سے ڈانٹ بھی کھائی۔ دوسرا لشکر حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں گیا تو ان کو فتح ہوئی۔ اسی یمامہ کی جنگ میں سب سے زیادہ صحابہؓ شہید ہوئے۔ مسیلمہ کذاب جب قتل ہوا اور اس کے لشکر کو شکست ہوئی تو سجاح روپوش ہو گئی اور بھاگ گئی۔ حضرت معاویہؓ کے زمانے تک روپوش رہی، پینتیس چالیس سال کے بعد ظاہر ہوئی، اس کی وجہ بھی یہ بنی کہ اس کے علاقے میں قحط پڑ گیا، خشک سالی ہو گئی، لوگ علاقہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ سجاح دمشق میں امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئی، توبہ کی، ایمان قبول کیا، پھر حضرت معاویہؓ کے حکم سے اس کو کوفہ میں بسایا گیا، وہیں اس نے زندگی گزاری۔ کہا جاتا ہے کہ بڑی عابدہ، زاہدہ اور صالحہ خاتون بن گئی تھی۔ وہیں فوت ہوئی اور اس وقت کے گورنر حضرت سمرہ بن جندبؓ نے اس کا جنازہ پڑھایا۔

یہ دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ کے چار مدعیانِ نبوت کا میں نے تذکرہ کیا۔ دو حوالوں سے میں ان کا ذکر کیا کرتا ہوں:

۱. ایک اس حوالے سے کہ حضورؐ اور صحابہ کرامؓ کا جھوٹے مدعیانِ نبوت کے متعلق طرزِ عمل کیا تھا کہ انہوں نے کسی کے دعوائے نبوت کو قبول نہیں کیا، بلکہ برداشت نہیں کیا۔
۲. اور دوسرے اس حوالے سے قادیانیوں سے کہتا ہوں کہ جو ہونا تھا ہو چکا، جو تم نے کرنا تھا کیا، جو تمہارے ساتھ ہونا تھا وہ ہوا، میں ان کو غور و فکر کی دعوت دیا کرتا ہوں کہ اسود عنسی اور مسیلمہ کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے تمہارے پاس دوسرا راستہ طلیحہ اور سجاح کا بھی موجود ہے۔ ہمیشہ کے لیے مصیبت میں رہنے اور مسلمانوں کو بھی مصیبت میں ڈالنے سے بہتر ہے یہ راستہ اختیار کر لو اور واپس آجاؤ، ہم قبول کریں گے، سینے سے لگائیں گے۔

اس کے بعد تیرہ سو سال میں کون کون مدعیانِ نبوت تھے، ان کے حالات بھی پڑھنے چاہئیں۔ ان کی تفصیل پڑھنے کے لیے مولانا ابوالقاسم محمد رفیق دلاوریؒ جو کہ حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد تھے، وزیر آباد کے قریب دلاور چیمہ گاؤں کے باشندے تھے، پھر لاہور میں رہے، بڑے مصنف تھے، ان

کی کتاب ''الصلوٰۃ عماد الدین'' معروف کتاب ہے، انہوں نے جھوٹے مدعیانِ نبوت پر ایک کتاب لکھی ''ائمہ تلبیس'' کے نام سے، اس میں مسیلمہ کذاب سے لے کر مرزا غلام احمد قادیانی تک سینکڑوں مدعیانِ نبوت کا ذکر کیا ہے۔ اس کا خلاصہ ''ایمان کے ڈاکو'' کے نام سے سو دو سو صفحے کا بھی ہے، لیکن علماء کو پوری کتاب ہی پڑھنی چاہیے، یہ دونوں کتابیں عالمی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت نے شائع کی ہیں۔

دورِ حاضر کے مدعیانِ نبوت

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ میری گفتگو کا ایک دائرہ یہ ہوتا ہے کہ جس دور میں ہم رہ رہے ہیں اس میں نئی نبوت اور وحی کے دعوے کے ساتھ کون کون سے گروہ دنیا میں موجود ہیں اور اپنا کام کر رہے ہیں۔ ان سے بھی ہمیں ضرور متعارف ہونا چاہیے، یہ تقریبًا چار یا پانچ ہیں، ان کا ذکر کرتا ہوں۔

ذکری مذہب

ایک تو ذکری مذہب ہے کہ بلوچستان میں مکران اور تربت کی پٹی ان سے بھری پڑی ہے، یہ تقریبًا چار سو سال سے چلے آ رہے ہیں، ان کی مختصر تاریخ ذکر کر دیتا ہوں۔

محمد مہدی

کم و بیش چار سو سال پہلے کی بات ہے کہ ایک صاحب تھے محمد مہدی۔ میرا قیاس ہے، کوئی حوالہ نہیں ہے، کہ جس زمانے میں ایران میں صفویوں نے قبضہ کیا اور زبردستی لوگوں کو شیعہ بنایا، اس دور میں کچھ لوگ وہاں سے بھاگے تھے، باطنی فرقہ کے لوگ بھی بھاگے تھے، ان میں یہ صاحب تھے محمد مہدی۔ ان میں باطنیت (اپنے مذہب کو چھپانا) تھی۔ یہ ۹۷۷ھ کی بات ہے، سرباز کے علاقے میں آئے۔ وہاں تربت کے علاقے میں ہمارے بزرگ قاضی عبد الصمد سربازیؒ گزرے ہیں۔ مہدی صاحب نے آکر دعویٰ کیا کہ میں مہدی ہوں، وہاں کا ایک سردار تھا مراد، جس کے نام پر کوہِ مراد ہے، وہ سب سے پہلے ایمان لایا۔ جہالت کا دور تھا، لوگ ساتھ ملتے گئے، ایک اچھا خاصا گروہ بن گیا۔ مہدی نے بعد میں نبوت اور وحی کا دعویٰ کر دیا اور کہا کہ میں افضل الانبیاء ہوں۔

''معراج نامہ''

ان سے ایک کتاب منسوب ہے ''معراج نامہ'' جو مجھے مولانا علی محمد قصر قندیؒ نے بتائی تھی۔ تعارف اور پہچان کے لیے اس میں سے ان کی خرافات میں سے ایک نقل کرتا ہوں۔ ''نقل کفر کفر نباشد''۔ اس ''معراج نامہ'' میں لکھا ہے کہ حضور نبی کریمؐ کو نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ معراج کرانے کی وجہ

یہ تھی کہ ایک مرتبہ آپؐ نے کہا میں تمام انبیاء کا سردار ہوں، اللہ کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ اللہ تعالیٰ نے عرش پر بلا لیا یہ دکھانے کے لیے کہ انبیاء کا سردار کون ہے، جب حضرت محمدؐ عرش پر تشریف لے گئے تو وہاں اللہ تعالیٰ بیٹھے ہوئے تھے اور ساتھ ملا محمد مہدی اٹکی بیٹھے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدؐ سے کہا کہ میں نے آپ کو یہ بتانے کے لیے بلایا ہے کہ انبیاء کا سردار یہ ہے جو میرے پہلو میں بیٹھا ہوا ہے۔

شرعی احکام کی تنسیخ

انہوں نے شریعت کے کچھ احکام منسوخ قرار دے رکھے ہیں، مثلاً نماز منسوخ کر دی اور اس کی جگہ کچھ مخصوص اذکار صبح و شام کے بتا دیے۔ یہی ان کا ٹائٹل بن گیا، اس علاقے کے مسلمانوں کو نمازی جبکہ ان لوگوں کو ذکری کہا جاتا ہے۔ روزے منسوخ کر دیے اور رمضان کی بجائے ذی الحجہ کے عشرے کے دس روزے طے کر دیے۔ اور حج بھی منسوخ کر دیا، کوہِ مراد پر ستائیس رمضان کو اکٹھے ہوتے ہیں، کوہِ مراد کا طواف کرتے ہیں، اور وہاں ایک میدان کو عرفات کا نام دیا ہوا ہے، وہاں وقوف کرتے ہیں، مصنوعی حج کرتے ہیں۔

ایک زمانے میں حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ نے بلوچستان کا دورہ کر کے مصنوعی حج کے خلاف فضا بنائی تھی اور حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ اسے بند کیا جائے۔ لیکن وہ کرتے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ ان کی آبادی ساحل کے ساتھ بہت ہے، کراچی میں بھی ہے۔ حضرت مولانا علی محمد قصر قندیؒ سابقہ ذکری تھے، بعد میں مسلمان ہوئے۔ جمعیت علماء اسلام میں ہمارے ساتھ کام کیا کرتے تھے، انہوں نے ذکری مذہب کے تعارف پر کتاب لکھی ہے۔ ہمارے ایک دوست حضرت مولانا احتشام الحق آسیا آبادیؒ تھے جو شہید کر دیے گئے، دارالعلوم کراچی کے فضلاء میں سے ہیں، ان کا اسی علاقے میں دارالعلوم رشیدیہ ہے، ان کے بھی ذکری مذہب کے تعارف پر دو رسالے ہیں۔ ذکریوں سے لوگوں کو بچانے اور عام لوگوں کا ایمان محفوظ رکھنے کے لیے جن لوگوں نے سالہا سال محنت کی ہے ان میں سب سے نمایاں نام کراچی میں حضرت مولانا علی محمد قصر قندیؒ کا اور بلوچستان میں حضرت مولانا احتشام الحق آسیا آبادی شہیدؒ کا ہے۔ مولانا آسیا آبادیؒ ایک سیمینار میں ہمارے ہاں کامونکی تشریف لائے تھے، انہیں دو سال پہلے بیٹے سمیت شہید کر دیا گیا۔

ذکری کلمہ

موجودہ دور کے مدعیانِ نبوت میں ذکری گروہ نئی نبوت، نئی وحی اور نئی کتاب کے نام سے ہمارے ملک میں موجود ہے۔ چار سو سال سے چلے آرہے ہیں، کسی زمانے میں اس پوری پٹی پر ان کی حکومت بھی رہی ہے۔ بلیدی خاندان ایک زمانے میں ذکری خاندان رہا ہے، سو سال سے زیادہ ان کی حکومت رہی ہے۔ مجھے بعض دوستوں نے بتایا کہ کراچی کے بعض قبرستانوں میں اس فرقے کے لوگوں کی قبروں کے کتبوں پر نعوذ باللہ یہ کلمہ لکھا ہوا ہے ”لا الہ الا اللہ، نور پاک محمد مہدی رسول اللہ“۔ ذکری لوگ کام سارا مسلمانوں کے انداز سے ہی کرتے ہیں کہ عام لوگوں کو پہچان نہیں ہوتی، سوائے قریبی لوگوں کے جو اُن کو جانتے ہیں۔

بہائی مذہب

دوسرا گروہ بہائی ہے جن کو بابی بھی کہا جاتا ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی سے ربع صدی پہلے کی بات ہے ۱۸۴۵ء اور ۱۸۵۰ء کے دور میں یہ گروہ شروع ہوا۔ اس کا پس منظر عرض کر دیتا ہوں۔

مرزا محمد علی

اہلِ تشیع کے اثنا عشری فرقے کا عقیدہ ہے کہ بارہویں امام غائب ایک غار سر من رای میں ہیں۔ حکومت کا اصل حق انہی کا ہے، وہی امام العصر ہیں۔ انیسویں صدی کے وسط میں مرزا محمد علی نامی ایک صاحب نے دعویٰ کیا کہ امام غائب سے میرا رابطہ ہو گیا ہے، ملاقات ہوئی ہے، امام غائب نے مجھے اپنا نمائندہ مقرر کیا ہے۔ ”الباب“ یعنی میں امام غائب اور امت کے درمیان دروازہ ہوں اور اب امام غائب کی ہدایات میرے ذریعے امت کو ملیں گی۔ یہ دعویٰ تاریخی روایات کے مطابق انہوں نے مکہ مکرمہ میں طواف کے دوران حرم میں کیا۔ ان کو بھی پیرو کار مل گئے، لوگ شامل ہوتے گئے۔ چونکہ یہ بات اثنا عشری عقیدے کے خلاف تھی تو اس وقت کی ایرانی سلطنت میں ان کے خلاف مقدمہ چلا اور تبریز چھاؤنی میں مرزا محمد علی باب کو ارتداد اور امام کی توہین کے جرم میں سزائے موت دے دی

گئی۔

مرزا بہاء اللہ شیرازی اور ''الواحِ مقدسہ''

مرزا محمد علی کے شاگردوں میں ایک صاحب تھے مرزا بہاء اللہ شیرازی۔ انہوں نے دعویٰ کر دیا کہ مرزا محمد علی تو میری بشارت دینے آئے تھے، اصل میں ہوں اور میں امام غائب نہیں بلکہ نبی ہوں اور مجھ پر وحی آتی ہے۔ مرزا شیرازی نے قرآن کریم کی منسوخی کا اعلان کیا۔ ان کی کتاب ''الواحِ مقدسہ'' کے نام سے ہے، اس میں قرآن کریم کے طرز پر سورتیں بنائی گئی ہیں، اس میں سورۃ الملک کی طرز پر سورۃ الملوک ہے۔ نمازیں منسوخ کر دیں اور قبلہ تبدیل کر دیا۔

جس زمانے میں صفویوں اور عثمانیوں کی کشمکش تھی، صفوی عالمِ اسلام میں شیعیت کے فروغ کے لیے کام کر رہے تھے، ایران پر تقریباً کنٹرول حاصل کر لیا تھا اور پھر عراق اور مصر میں اپنے پاؤں بڑھا رہے تھے، تو عثمانی خلفاء نے مزاحمت کی اور سلطان سلیم اول کے دور میں صفویوں اور عثمانیوں کی بڑی جنگ ہوئی، جس جنگ کے نتیجے میں مصر بچ گیا، ورنہ ایران کی طرح مصر بھی صفویوں نے گھیرے میں لے لیا تھا۔ سلطان سلیم اول مقابلے پر آئے تھے۔ عثمانیوں نے صفویوں کا مقابلہ کیا اور اس کا مذہبی پس منظر بالکل واضح تھا۔ میں نے الشیخ مصطفٰی صبریؒ جو کہ خلافت عثمانیہ کے آخری شیخ الاسلام اور شیخ زاہد الکوثریؒ کے استاد تھے، ان کی یادداشتوں میں پڑھا کہ صفویوں اور عثمانیوں کی جنگ کے بعد جو معاہدہ ہوا تھا، اس معاہدے کی ایک شق یہ بھی تھی کہ صفویوں نے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ حضرات صحابہ کرامؓ بالخصوص حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کی توہین نہیں کریں گے۔ چنانچہ یہ مسائل اس وقت بھی تھے۔

بہرحال اس کشمکش سے بہاء اللہ شیرازی نے فائدہ اٹھانا چاہا، چونکہ ایران میں سبھی اثناعشری علماء تھے اور انہوں نے بہاء اللہ شیرازی کو برداشت نہیں کیا تو اس مخاصمت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ صاحب قسطنطنیہ چلے گئے تاکہ صفویوں کے خلاف عثمانیوں کی کشمکش سے فائدہ اٹھائیں۔ انہوں نے سیاسی پناہ دی لیکن کچھ عرصے کے بعد عثمانیوں کو اندازہ ہو گیا کہ یہ ٹھیک نہیں ہوا۔ یہ صاحب ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں ہیں تو انہوں نے قسطنطنیہ سے نکال دیا۔

بہائیوں کا قبلہ

پھر بہاء اللہ شیرازی نے فلسطین میں عکہ نامی جگہ پر اپنا ٹھکانہ بنا لیا اور آزاد گروپ کے طور پر کام کرتے رہے۔ اب بہائیوں کا قبلہ عکہ ہی ہے، بہاء اللہ شیرازی عکہ میں فوت ہوئے، وہیں ان کی قبر ہے، ان کے بیٹے مرزا عبد البہاء نے بھی عکہ ہی کو مرکز رکھا اور انہوں نے دنیا میں پھیلنا شروع کر دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس وقت کے فلسطین کے صدر محمود عباس بہائیوں میں سے ہیں، اور یہ بھی فلسطین کے تنازعے میں عکہ کے حوالے سے فریق ہیں۔

بہائی مذہب کے امتیازات میں یہ ہے کہ نماز منسوخ کر دی، الواحِ مقدسہ کے نام سے نئی تعلیمات دیں، اور یہ تصور دیا کہ ہم تمام مذاہب کے جامع ہیں۔ ان کے مطابق پہلے تمام انبیاء نہریں تھیں اور بہاء اللہ شیرازی سمندر ہے جس میں ساری نہریں اکٹھی ہو گئی ہیں۔ کہتے ہیں ہم مجمع البحار ہیں، بہاء اللہ شیرازی خاتم الانبیاء ہے، اس کی تعلیمات نسلِ انسانی کی رہنما ہیں۔ عورت اور مرد کی ہر لحاظ سے مساوات کا تصور مذہبی طور پر انہوں نے پیش کیا کہ عورت اور مرد کے احکام اور معاشرت میں کسی حوالے سے کوئی فرق نہیں ہے۔ جبکہ ہمارا مغرب کے ساتھ جھگڑا ہے کہ مرد اور عورت کی نفسیات، خلقت، اور فطری فرائض میں فرق ہے، اس لیے احکام بھی دونوں کے یکساں نہیں ہیں۔

اتحاد بین المذاہب کا عنوان

اتحاد بین المذاہب بہائیوں کا ٹائٹل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم تمام مذاہب کو حق سمجھتے ہیں اور تمام مذاہب کے اتحاد کے قائل ہیں۔ عملی طور پر اس کا ایک مظہر میں نے خود دیکھا ہے۔ ۱۹۸۸ء، ۱۹۸۹ء کی بات ہے، حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ اور میں شکاگو (امریکہ) میں جناب ریاض حسین وڑائچ کے مہمان تھے۔ مجھے کسی نے بتایا کہ شکاگو میں بہائیوں کے عالمی مراکز میں سے ایک مرکز ہے۔ ان کے تین چار عالمی مراکز ہیں، دہلی، شکاگو اور لندن وغیرہ میں۔ میرا ذوق یہ ہے کہ ایسی جگہوں میں جاتا ہوں اور معلومات حاصل کرتا ہوں کہ ان کا دائرہ کار کیا ہے اور کام کا طریقہ کار کیا ہے، اور ان سے تبادلۂ خیالات کرتا ہوں تاکہ پوری پوزیشن معلوم ہو۔ مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ سے میں نے بات کی کہ ہم بہائیوں کے مرکز چلتے ہیں، دیکھتے ہیں کیا نوعیت ہے؟ ہم تینوں وہاں گئے، جا کر جب ریسیپشن پر کارڈ

لیا توانہوں نے ہمیں پہچان لیا۔ پہلے سے ہمیں جانتے تھے، پورے اعزاز کے ساتھ انہوں نے ہمیں وہاں کا وزٹ کروایا۔

اس میں سے ایک بات میں ذکر کرنا چاہ رہا ہوں۔ انہوں نے ہمیں ایک بہت بڑا ہال دکھایا، اس ایک ہال میں ایک چھت کے نیچے چھ مذاہب کے عبادت خانے بنے ہوئے تھے، بالکل ان کے اپنے اپنے ماحول کے مطابق۔ ایک کونے میں مسجد کی طرز کا عبادت خانہ بنا ہوا تھا جس میں مسجد کا ماحول منبر، دریاں، تپائیاں پڑی تھیں۔ دوسرے کونے میں گرجا تھا، ان کے ماحول کے مطابق۔ ایک کونے میں ہندوؤں کا مندر۔ ایک کونے میں یہودیوں کا معبد۔ بالکل وسط میں سکھوں کا گردوارہ اور بدھوں کا عبادت خانہ۔ ایک چھت کے نیچے چھ عبادت خانے بنے ہوئے ہم نے دیکھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں سب لوگ آتے ہیں، ہم سب کو حق سمجھتے ہیں، ہماری طرف سے اجازت ہے ہر کوئی اپنے عبادت خانے میں اپنے طریقے کے مطابق عبادت کرے۔ ہمارے سامنے بھی لوگ آرہے تھے، ایک سکھ گردوارے میں گرنتھ پڑھ رہا تھا۔

اس کے انچارج انڈین تھے اور اردو بولتے تھے۔ مجھ سے پوچھنے لگے آپ کو یہ منظر کیسا لگا کہ ہم نے چھ مذاہب ایک چھت کے نیچے اکٹھے کیے ہوئے ہیں؟ میں نے کہا آپ نے یہ تو کر لیا کہ مندر، مسجد، گرجا اور گردوارہ کو اکٹھا کر لیا، لیکن مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ ایک خدا اور تین خدا کے عقیدے ایک چھت کے نیچے کیسے اکٹھے ہو گئے؟ کہنے لگے یہ فلسفے کی باتیں ہیں۔ میں نے کہا نہیں یہ عقیدے کی باتیں ہیں۔

بہرحال اتحاد بین المذاہب کے عملی مناظر ان کے ہاں ملتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اکبر بادشاہ نے ''دینِ الٰہی'' کے نام سے جو ملغوبہ بنایا تھا، اس نے بھی یہی کیا تھا۔ یہ نئی بات نہیں ہے، اس دور میں بہائی اس کے مذہبی طور پر دعویدار ہیں۔ آج کا بین الاقوامی موضوع بھی یہ ہے کہ سارے مذہب حق ہیں، سب کا اتحاد ہونا چاہیے، سب کی صحیح باتیں اکٹھی کر کے مشترکہ کام کیا جانا چاہیے، اس پر کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ لیکن یاد رکھیں کہ مکالمہ بین المذاہب کا دائرہ اور ہے، اتحاد بین المذاہب کا دائرہ اور ہے۔

انیس کا عدد

بہائیوں کا ایک اور امتیاز ہے جو اُن کے دائرے میں ہی محدود ہے، وہ یہ کہ ان کے ہاں انیس کا

عدد بہت متبرک ہے۔ حالانکہ قرآن میں تو انیس کا عدد جہنم کے حوالے سے ذکر ہوا ہے۔ انہوں نے اپنا الگ کیلنڈر تشکیل دیا ہوا ہے جس میں انیس مہینے، اور ہر مہینے کے انیس دن ہیں۔ اس کا پس منظر کیا ہے یا نتائج کیا ہیں؟ یہ ان کو ہی معلوم ہو گا۔ آج سے پچیس سال پہلے اس حوالے سے ہمارے ہاں بھی ایک تحریک چلی تھی کہ انیس کا عدد خاص عدد ہے ریاضی کے حوالے سے، اس کی کچھ خصوصیات ہیں۔

ہمارے ایک مناظر احمد دیدات تھے جو افریقہ کے تھے، عیسائیوں کے خلاف اچھے مناظر تھے، وہ انیس کے عدد کے فارمولے سے بہت متاثر ہوئے بلکہ میں بھی ابتدائی متاثرین میں سے ہوں۔ میں نے بھی اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کی ایک نشست میں اس موضوع پر بات کی تھی کہ قرآن کریم کے اعجاز کی ایک نئی صورت سامنے آئی ہے۔ اس وقت ہمارا تاثر یہ تھا کہ وجوہِ اعجاز میں سے ایک نئی وجہ ریاضی کے قاعدے سے سامنے آئی ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ و آیات حروفِ ابجد کے حساب سے ''انیس کے فارمولے'' پر فٹ بیٹھتی ہیں۔ اس پر کتابیں اور پی ایچ ڈی کے مقالات بھی آئے، میں نے بھی کچھ لکھا۔ بظاہر یہی تھا اور عام علماء بھی خوش تھے قرآن پاک کے اعجاز کی ایک نئی صورت سامنے آئی ہے۔

احمد دیدات صاحب تو فوت ہو گئے، امریکہ کے ایک صاحب تھے خلیفہ رشاد مصری، انہوں نے اس کو کمپین ہی بنالیا کہ انیس کا عدد، انیس کا عدد۔

۱. یہ بات تب کھٹکی جب خلیفہ رشاد نے یہ جملہ کہا کہ قرآن کریم تو انیس کے اس فارمولے پر پورا اترتا ہے، حدیث کوئی نہیں پوری اترتی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ یہ پہلا اسٹیج تھا خلیفہ رشاد کا۔
۲. کچھ سال بعد انہوں نے اگلا قدم اٹھایا اور کہا کہ قرآن کی بھی بعض سورتیں انیس کے فارمولے پر پوری نہیں اترتیں، مثلاً آیت ''لقد جائکم رسول من انفسکم'' (التوبہ ۱۲۸) اور معوذتین۔ لگتا ہے یہ الحاقی ہیں، قرآن کریم کی نہیں ہیں۔ یہاں اس فارمولے کو بریک لگ گئی، دنیا بھر میں لوگوں نے کہا کہ ہم اس فارمولے کو قبول نہیں کرتے۔ یہ دوسرا اسٹیج تھا خلیفہ رشاد کا۔

۳. خلیفہ رشاد کا تیسرا اسٹیج یہ تھا کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا کہ مجھ پر وحی آتی ہے۔ بعد میں اپنے ہی ایک مرید کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

اصل میں اس انیس کے عدد کے فارمولے کے موجد بہائی تھے۔ یہ ان کے امتیازات میں سے ہے اور اسے ان کے ہاں تقدس حاصل ہے۔

بہائیوں اور قادیانیوں میں مماثلت

ایک حوالہ بہائیوں کے بارے میں اور دینا چاہوں گا۔ پاکستان بننے کے بعد یہ مسئلہ درپیش تھا کہ قادیانی یہاں کلیدی آسامیوں پر اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہے تھے۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک نے اس کو بریک لگائی، اور یہ تحریک ان کے خلاف بہت بڑی رکاوٹ بن گئی۔ اس کے بعد سے اب تک قادیانی اسی کوشش میں ہیں لیکن الحمدللہ کامیاب نہیں ہوئے۔ بھٹو مرحوم نے بھی یہ بات کہی کہ احمدی پاکستان میں وہ پوزیشن حاصل کرنا چاہتے ہیں جو امریکہ میں یہودیوں کو حاصل ہے کہ کوئی فیصلہ ان کی منشا کے خلاف نہ ہو، میں اس کو کیسے برداشت کر سکتا ہوں۔

ایران میں بادشاہت کے دور میں بہائیوں نے یہ پوزیشن حاصل کر لی تھی کہ وہاں کے بڑے جرنیل، بیوروکریٹ حتیٰ کہ ان کے ایک وزیراعظم امیر عباس ہویدا بہائی تھے۔ خمینی انقلاب میں آیت اللہ خلخالی نے بہائیوں کو ٹارگٹ کیا، ان کو نکالا اور قتل بھی کیا۔ یہ اس وقت وہاں سے بھاگے اور مختلف علاقوں میں پناہ لی۔ اس وقت بہت سے بہائی ایران، عرب، فلسطین، امریکہ، برطانیہ اور پاکستان میں ہیں۔ پاکستان میں ان کے مراکز پشاور، سیالکوٹ، لاہور، کوئٹہ سمیت بارہ شہروں میں کام کر رہے ہیں۔ ان کا اردو ماہنامہ نفحات میرے پاس آتا رہا ہے، پشاور سے چھپتا تھا۔ ان کے مظفر آباد کے ایک بڑے دانشور صابر آفاقی کی اور میری خط و کتابت بھی چلتی رہی ہے۔

یہ میں نے بہائیوں کا تعارف، پس منظر اور دائرہ کار، اور بنیادی امتیاز بیان کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ کہاں کہاں ہیں۔

نیشن آف اسلام

اس کے بعد ختم نبوت کا انکار کرنے والے ایک اور گروہ کا ذکر کرنا چاہوں گا جو اس وقت متعارف بھی ہے اور موجود بھی ہے۔ یہ ''نیشن آف اسلام'' کے نام سے امریکہ میں سیاہ فام لوگوں کا بہت بڑا گروہ ہے۔ اس وقت لوئس فرخان ان کے لیڈر ہیں اور دنیا میں ان کو امریکی مسلمانوں کا نمائندہ لیڈر سمجھا جاتا ہے، اس لیے کہ لوگوں کو پتہ نہیں ہے، لوگ انہیں مسلمان سمجھتے ہیں اور بڑی بڑی کانفرنسوں میں ان کے لیڈر کو دعوت دی جاتی ہے۔ طرابلس کی سالانہ میلاد کانفرنس میں آتے رہے ہیں، پاکستان میں ایک صاحب نے ان کو دعوت دی تھی، ہم نے کوشش کر کے رکوائی۔ امریکی مسلمانوں کے نمائندہ کے طور پر بنگلہ دیش اور عراق کا دورہ کر چکے ہیں۔ لیکن یہ جس نیشن آف اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں اس کا تعارف عرض کر دیتا ہوں۔

امریکہ میں گوروں اور کالوں کی کشمکش

نیشن آف اسلام کی بنیاد بھی دعوائے نبوت پر ہے لیکن اس سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ امریکہ میں کالوں اور گوروں کا امتیاز اور کشمکش صدیوں پرانی ہے۔ امریکیوں نے اپنی اصل آبادی تو نہ معلوم کہاں کنارے لگا دی ہے، جسے ریڈ انڈین کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ گورے یورپ کے ملکوں جرمنی، اسپین اور برطانیہ وغیرہ سے جا کر بسنے والے، جبکہ کالے افریقہ سے جا کر بسنے والے لوگ ہیں۔ کالوں کو غلام بنا کر لاتے تھے اور ان سے کام لیتے تھے۔ اس کشمکش کے اثرات اب بھی کسی حد تک ہیں۔ اس کشمکش میں کالوں اور گوروں میں فرق عملاً اور قانوناً بہت دیر تک رہا ہے۔ ۱۹۶۴ء میں امریکی صدر جے ایف کینیڈی کے دور تک کالوں اور گوروں کے کالج اور ریسٹورنٹ وغیرہ الگ الگ تھے، دونوں کی کالونیاں الگ الگ تھیں، حتیٰ کہ بسوں میں سیٹیں بھی الگ الگ ہوتی تھیں کہ کوئی کالا گورے کی سیٹ پر نہیں بیٹھ سکتا تھا اور گورا کسی کالے کی سیٹ پر تو بیٹھتا ہی نہیں تھا۔

کالوں اور گوروں کے درمیان کشمکش کے آخری راؤنڈ کا آغاز ایک تاریخی واقعہ سے ہوا۔ ایک دفعہ برنگھم (الاباما، امریکہ) میں یہ ہوا کہ ایک بس میں کالج کی کالی لڑکی سوار ہوئی، کالوں کی سیٹیں خالی نہیں

تھیں تو وہ گوروں کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ گاڑی والوں نے اسے کہا، یہاں سے اٹھو یہ گوروں کی سیٹ ہے۔ اس نے کہا یہ سیٹ خالی پڑی تھی تو میں بیٹھ گئی، کوئی بیٹھنے والا آیا تو میں اٹھ جاؤں گی۔ لوگوں نے اسے اٹھنے پر مجبور کرنا چاہا، اس نے انکار کر دیا۔ اس پر ڈرائیور نے بس روک لی اور پولیس کو اطلاع دی گئی۔ پولیس نے آ کر اس لڑکی کو گرفتار کر لیا کہ گوروں کی سیٹ پر کیوں بیٹھی ہو؟ اس پر وہاں کے پادری مارٹن لوتھر کنگ نے کچھ لوگ اکٹھے کیے۔ مارٹن لوتھر دو ہیں، ایک جرمنی کے تھے جنہوں نے پاپائے روم سے بغاوت کر کے پروٹسٹنٹ فرقے کی بنیاد رکھی تھی، اور دوسرے یہ تھے۔ شام کے وقت ایک پارک میں احتجاجی مظاہرہ کیا کہ یہ زیادتی ہے، لڑکی کو بلاوجہ گرفتار کیا گیا ہے۔ میں نے وہ پارک اور مارٹن لوتھر کا میوزیم دیکھا ہے۔ تو گوروں کی پولیس نے ان کو گھیر کر ان پر فائرنگ کی، ان پر بھوکے کتے چھوڑے اور ان کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

یہاں سے احتجاجی تحریک شروع ہوئی اور مارٹن لوتھر کنگ نے پورے ملک میں کالوں کو منظم کیا۔ ایک سال اس نے تحریک چلا کر ۱۹۶۵ء میں ملین مارچ کیا۔ ملین مارچ کی جو اصطلاح استعمال ہوتی ہے اصل میں یہ اس کی اصطلاح ہے، سب سے پہلا ملین مارچ اس نے کیا تھا۔ پورے امریکہ سے کالوں کو اکٹھا کر کے واشنگٹن میں دس لاکھ انسانوں کا پُرامن جلوس نکالا۔ صدر کینیڈی کا زمانہ تھا، وہ وائٹ ہاؤس سے سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ مارٹن لوتھر کنگ کی وہ تقریر دنیا کی شاہکار تقریروں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس میں اس نے کہا میرا خواب ہے کہ میں یہ دیکھوں کالا اور گورا ایک میز پر بیٹھے چائے پی رہے ہیں، میرا خواب ہے کہ میں دیکھوں کہ کالج میں گورا اور کالا اکٹھے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہ ایک تاریخی تقریر ہے۔

اس کے بعد، صدر کینیڈی نے اسے بلایا اور ان کے مذاکرات ہوئے جس کے نتیجے میں کالوں اور گوروں کے امتیاز کا قانون ۱۹۶۵ء میں ختم ہوا۔ اس سے پہلے کالوں کو ووٹ کا حق نہیں تھا، سپریم کورٹ تک لڑائی لڑ کر یہ حق حاصل کیا گیا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے امریکہ کی وزیر خارجہ تھی کونڈولیزا رائس جو وہاں کے بڑے دانشوروں میں شمار ہوتی ہے، وہ برنگھم الاباما کی ہے، میں نے اس کا گھر دیکھا ہے، اس کے باپ کو سپریم کورٹ نے ووٹ کا حق دلوایا تھا، جس نے اس کے لیے طویل عدالتی جنگ لڑی تھی۔

ماسٹر فارد محمد

میں نے کالوں اور گوروں کا پس منظر اس لیے بتایا ہے تاکہ ''نیشن آف اسلام'' آپ کو سمجھ آسکے۔ ۱۹۳۰ء میں ایک صاحب ماسٹر فارد محمد افریقہ سے ڈیٹرائٹ شہر میں گئے، وہاں جا کر کالوں سے کہا کہ میں اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ہوں، مکہ سے آیا ہوں اور کالوں کی نجات کے لیے مجھے بھیجا گیا ہے، کالوں کو منظم کرنے آیا ہوں اور میں تمہارا نجات دہندہ ہوں۔ نام اس نے اسلام کا استعمال کیا اور نوبل قرآن کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔ بنیادی تصور یہ دیا کہ کالے جو افریقہ سے لائے گئے تھے اصلاً مسلمان تھے، ان کو جبرًا عیسائی بنایا گیا تھا، ان کو دوبارہ اسلام کی طرف واپس جانا چاہیے۔ چار سال ان کی تحریک چلتی رہی، ٹیمپل کے نام سے مذہبی مرکز بنایا۔

آلیجا محمد

پھر ان کو ایک صاحب الیجیج پال مل گئے جو آلیجا محمد کہلاتے ہیں، یہ دراصل الیاس کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ جیسے یعقوب کو جیکب اور آدم کو ایڈم بولتے ہیں۔ الیجیج پال عیسائی تھا جو فارد محمد کے ہاتھوں مسلمان ہوا، بہت متحرک آدمی تھا۔ ۱۹۳۴ء میں فارد محمد غائب ہو گئے اور یہ صاحب کھڑے ہو گئے کہ فارد محمد میری بشارت دینے کے لیے آئے تھے، اصل میں کالوں کا نجات دہندہ میں ہوں۔ میں کالوں کو نجات دلاؤں گا اور اسلام کی طرف لے جاؤں گا۔ پھر الیجیج پال سے آلیجا محمد نام رکھ لیا۔

اس مذہب کی بنیاد گوروں سے نفرت پر تھی۔ نفرت کا اندازہ اس سے کریں کہ ایک دور میں ہر سفید چیز اُن کے ہاں حرام ٹھہری، جیسے سفید کپڑا اور انڈہ وغیرہ۔ اور یہ بات ان کے عقیدے میں شامل ہے، میں نے ان کی کسی کتاب میں پڑھا کہ سارے انسان کالے تھے، شیطان کی نسل گوروں سے چلی ہے اور آدم کی نسل کالوں سے چلی ہے۔ اور یہ بھی لکھا تھا کہ ''آدم کان اسود، نوح کان اسود، یوسف کان اسود، محمد کان اسود''۔ اصل میں صدیوں کی نفرت پیچھے چلی آ رہی تھی۔ ایک دن میں نے وہاں تقریر میں کہا سیاسی طور پر تو میرا بھی یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ گورے شیطان کی اولاد ہیں لیکن عقیدے کے طور پر نہیں کہ بہرحال وہ انسان ہیں۔

مالکم شہبازؒ

جب آلیجا محمد نے نبوت کا دعویٰ کیا تو ان کو ایک صاحب مالکم لٹل ملے، یہ چوروں کا سرغنہ تھا، جیل میں ان کی ملاقات ہوئی، اس نے آلیجا محمد کے ہاتھ پر ''اسلام'' قبول کیا، آہستہ آہستہ وہ اس کا دستِ راست بن گیا اور اس کا منسٹر کہلاتا تھا۔ اس نے مالکم لٹل سے مالکم شہباز نام اختیار کیا کہ افریقہ سے ہمارا جو قبیلہ آیا تھا اس کا نام شہباز تھا۔ لیکن بعد میں اس نے آلیجا محمد کا پول کھولا۔ اس کی یادداشتیں میں نے پڑھی ہیں اور اس کی کچھ اقساط چھاپی بھی تھیں۔ مالکم شہباز کہتا ہے دنیا میں گھومتے پھرتے میں حج پر چلا گیا۔ وہاں میں نے بیت اللہ کا طواف کرتے گوروں کو بھی دیکھا کالوں کو بھی دیکھا۔ شامی، لبنانی، ترکی گورے ہیں۔ تو میں شک میں پڑ گیا کہ کعبہ تو آدم نے بنایا تھا، شیطان کی نسل گورے یہاں کیا کر رہے ہیں؟ میں علماء سے ملا تو پتہ چلا کہ امریکہ میں تو سارا ڈرامہ رچایا گیا ہے۔ اصل اسلام تو یہ ہے۔

مالکم شہباز نے حجاز کے علماء کے ہاتھ پر توبہ کی اور وہ شافعی المذہب سنی مسلمان بن گئے۔ انہوں نے امریکہ واپس جا کر بتایا کہ یہ صاحب جھوٹ بولتے ہیں، صحیح اسلام وہ ہے جو مکہ اور مدینہ میں ہے۔ انہوں نے اپنا گروپ الگ کر لیا جو مالکم شہباز گروپ کہلاتا ہے۔ نیویارک میں ان کا مرکز ہے مالکم شہباز شہید ماسک (مسجد)۔ اچھا مرکز ہے، میں نے وہاں بھی حاضری دی ہے۔ انہوں نے لوگوں کو آلیجا محمد سے باغی کیا لیکن صرف ایک سال کام کر سکے۔ ۱۹۶۴ء میں انہوں نے بغاوت کا اعلان کیا تھا، ایک سال کے بعد ۱۹۶۵ء میں ان کو شہید کر دیا گیا۔ لیکن ان کا گروپ چلتا رہا۔

عقائد و تعلیمات

آلیجا محمد نے ۱۹۳۴ء میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ ۱۹۷۵ء تک وہ نئی نبوت اور وحی کے دعوے پر رہے، اور اس دعوے پر کہ قرآن پرانا ہو گیا ہے اب میری تعلیمات میں نجات ہے۔ ان کا رسالہ نکلتا ہے ''دی فائنل کال''۔ اس کے کچھ صفحات میرے پاس فوٹو کاپی ہیں، اس کے مطابق ان کے بارہ تیرہ عقائد جو اس میں مسلسل چھپتے ہیں، اس میں ایک عقیدہ یہ ہے کہ ماسٹر فارد محمد (پہلا نجات دہندہ) جو ۱۹۳۰ء میں نمودار ہوئے تھے اور ۱۹۳۴ء میں غائب ہوئے تھے، وہ دراصل اللہ تعالیٰ تھے، کالوں کو راستہ دکھانے آئے تھے، چار سال ان میں رہے اور پھر ماسٹر آلیجا محمد کو اپنا نبی بنا کر عرش پر واپس چلے

گئے۔ اس کا اگلا جملہ یہ ہے کہ یہ وہی موسیٰ ہے جس کا یہود کو انتظار ہے، وہی مسیح ہے جس کا عیسائیوں کو انتظار ہے، اور وہی مہدی و مسیح ہے جس کا مسلمانوں کو انتظار ہے۔

قیامت کے بارے میں ان کا عقیدہ نہ ہندوؤں جیسا ہے اور نہ مسلمانوں جیسا۔ ہندوؤں کا عقیدہ دوبارہ جنم بدلنے کا اور تناسخ کا ہے۔ جبکہ نیشن آف اسلام کے ہاں قیامت اس شکل میں آئے گی کہ دنیا میں گوروں کا تسلط ختم ہو جائے گا۔ اس وقت گورے جنت میں ہیں، کالے جہنم میں ہیں، لیکن دنیا کے حالات پلٹا کھائیں گے اور دنیا پر کالوں کا غلبہ ہوگا، گورے مغلوب اور کالوں کے غلام ہوں گے۔ یہ قیامت ہوگی۔ اس قسم کے عقائد کے ساتھ اس وقت بھی امریکی کالوں میں یہ تعداد کے حوالے سے سب سے بڑا گروپ ہے۔ ایک لطیفہ یہ ہوا کہ میں نے وہاں ایک مجلس میں سوال کیا کہ کالے آدمؑ کی نسل ہیں اور انسان ہیں، گورے شیطان کی نسل ہیں، لیکن ہم ایشین نہ کالے ہیں نہ گورے، ہم گندمی لوگ ہیں تو ہم کس کی نسل ہیں؟

عالمی مکہ باز محمد علی کلےؒ

سب سے پہلے آلیجا محمد سے مالکم شہباز نے بغاوت کی، پھر بہت سے بڑوں نے بغاوت کی۔ عالمی مکہ باز محمد علی کلے جو چند سال پہلے فوت ہوئے، یہ پہلے آلیجا محمد کے ہاتھ مسلمان ہوئے تھے، جب شہباز نے بغاوت کی تو یہ بھی بغاوت میں ساتھ آئے اور صحیح العقیدہ مسلمان ہوئے۔ ان کے ایک بڑے رہنما امام سراج وہاج ہیں، نیویارک کے ہیں۔ میں ان کے مرکز گیا تھا، بہت بڑا مرکز ہے، ان سے میری ملاقات ہوئی ہے۔ انہوں نے بھی پہلے آلیجا محمد کے ہاتھ کلمہ پڑھا تھا، جب مالکم شہباز نے بغاوت کی اور صحیح عقیدے پر آئے تو یہ بھی ان کے ساتھ باغیوں میں سے تھے۔ یہ جتنے بھی باغی ہیں تقریباً سب اہلسنت شافعی المذہب ہیں۔ امام سراج وہاج اچھا کام کر رہے ہیں، دنیا میں کانفرنسوں میں جاتے ہیں، نمائندگی کرتے ہیں۔

ویلس دین محمد

ایک بڑی تبدیلی یہ آئی کہ آلیجا محمد ۱۹۷۵ء میں فوت ہوئے، ۱۹۳۴ء سے ۱۹۷۵ء تک ان کی نبوت کا دور ہے۔ ان کے بیٹے ویلس دین محمد باپ کے مرنے کے بعد اس کے عقائد سے منحرف ہو کر مالکم

شہباز کی طرف چلے گئے۔ ان سے بھی میری ملاقات ہوئی ہے، شکاگو کی ایک بڑی کانفرنس میں ہم اکٹھے تھے۔ یہ بھی شافعی المذہب ہیں، اس وقت کالوں میں صحیح العقیدہ قیادت کرنے والے لوگ امام سراج وہاج، مالکم شہباز کا گروپ اور ویلس دین محمد محنت کر رہے ہیں۔

لوئیس فرخان

لیکن بڑا گروپ آج بھی لوئس فرخان کا ہے جو ماسٹر فارد محمد کو خدا کا پرتو اور آلیجا محمد کو نبی مانتے ہیں۔ دھوکے کی فضا ابھی تک صاف نہیں ہوئی۔ میں جب شکاگو گیا، ۱۹۸۸ء، ۱۹۸۹ء کی بات ہے، مجھے ساتھیوں نے بتایا کہ لوئس فرخان نے ایک کانفرنس کی ہے کہ تمام مسلمان مکاتبِ فکر اکٹھے ہوں، سب کو اکٹھا کیا، خود بھی اس میں تھا، اس میں رابطہ عالمِ اسلامی کی طرف سے نمائندہ اور مہمانِ خصوصی شیخ علی عبد الرحمٰن الحذیفی امامِ حرمین تھے۔ یہ کانفرنس ہمارے جانے سے ایک ماہ پہلے ہو چکی تھی۔ ساتھی پریشان تھے کہ یہ کیا ہوا؟ میں نے کہا ایسے بات نہیں بنے گی۔ آپ ان کا پورا تعارف لکھیں اور فائل بنائیں۔ میں نے واپسی عمرہ پر آنا تھا، میں نے کہا واپسی پر رابطہ عالمِ اسلامی والوں سے بات کروں گا۔ انہوں نے پوری فائل بنائی اور شیخ حذیفی اور فرخان کی ایک مجلس کی تصویریں بھی دیں۔ اس وقت کے رابطہ کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر عبد اللہ عمر نصیف تھے، میں مکہ مکرمہ میں مولانا عبد الحفیظ مکیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ فائل ان کو دکھائی، ہم دونوں مل کر رابطہ کے سیکرٹری جنرل سے ملے اور بتایا امریکہ میں یہ صورتحال ہے۔ اس کے بعد رابطے والوں نے ان سے رابطہ منقطع کر لیا۔ اتنا حصہ اس میں ہمارا بھی ہے۔

لوئس فرخان دنیا کے مختلف حصوں میں اپنے آپ کو مسلم امیریکن لیڈر قرار دے کر جاتے ہیں، کرنل قذافی صاحب کے ہاں لیبیا جاتے رہے ہیں، وہاں سالانہ میلاد کانفرنس ہوتی ہے اس میں ایک بار مہمان خصوصی تھے۔ میں نے وہی فائل جو رابطہ کے سیکرٹری جنرل کو دی تھی، اسی کی کاپی پاکستان آ کر لیبیا کے سفارت خانے کو بھجوائی کہ یہ دیکھو یہ صورتحال ہے، مجھے اس کی وصولی کا خط بھی ملا تھا۔

لوئس فرخان بنگلہ دیش کے دورے پر آئے تھے تو وزیر اعظم خالدہ ضیاء صاحبہ نے ایئرپورٹ پر ان کا استقبال کیا تھا، اور وہاں کے ایک مولانا صاحب نے مجھے لندن میں بتایا کہ میں بھی ان کا استقبال کرنے والوں میں شامل تھا کیونکہ مجھے تو پتہ نہیں تھا، میں نے سمجھا کہ مسلمانوں کے لیڈر ہیں۔ ہمارے

یہاں محترم شیخ رشید صاحب جب وفاقی وزیر تھے انہوں نے ان کو دعوت دی کہ آپ پاکستان آئیں ہم آپ کا استقبال کریں گے۔ اللہ کی قدرت کہ مجھے اور مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ کو پتہ چل گیا تو ہم راجہ ظفر الحق صاحب سے ملے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ چونکے۔ یہ بھی اس وقت وزیر تھے، انہوں نے کہا، مجھے تو علم نہیں تھا کہ یہ کون ہیں۔ اس طرح یہاں کا دورہ ہم نے رکوایا ورنہ اسلام آباد بھی استقبال کے لیے تیار تھا۔

"نیشن آف اسلام" کی صورتحال میں نے آپ کے سامنے عرض کی ہے۔

حضرات علماء کرام! میں نے آپ کے سامنے چند گروہوں کا ذکر کیا ہے جو اسلام کا نام استعمال کرتے ہوئے نئی نبوت اور وحی کے نام پر موجود ہیں اور کام کر رہے ہیں، ان کا مختصر تعارف کروایا ہے۔ بڑا گروپ قادیانیت باقی ہے، اس کا تعارف کہ قادیانیت کیا تھی، کیا ہے، اب کیا جھگڑا چل رہا ہے، بین الاقوامی تنازعہ کیا ہے، اور مستقبل کے امکانات کیا ہیں؟ اس پر اگلی نشست میں قدرے تفصیل کے ساتھ بات ہوگی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قادیانیت

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ حضرات علماء کرام! آپ سے مدعیان نبوت کے حوالے سے گفتگو چل رہی ہے کہ ہمارے زمانے میں نئی نبوت اور نئی وحی کے عنوان سے جو گروہ قائم ہوئے اور اس وقت موجود اور مختلف علاقوں میں متحرک ہیں، ان میں سے ذکریوں، بہائیوں، خلیفہ رشاد اور نیشن آف اسلام ذکر کیا تھا۔ نئی نبوت کا دعویدار بڑا گروہ قادیانیت ہے، اس کا آج ذکر کرتے ہیں۔

چونکہ قادیانیت کا مسئلہ ہمارے علاقے برصغیر کا مسئلہ ہے، ہماری براہِ راست ان کے ساتھ تقریباً سوا سو سال سے کشمکش چل رہی ہے، اس لیے زیادہ تربات ان کے ہی بارے میں کی جاتی ہے اور زیادہ مسائل بھی ان کے حوالے سے ہی درپیش ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں ختمِ نبوت کے حوالے سے جتنا کام ہوتا ہے نوے فیصد قادیانیوں کے حوالے سے ہوتا ہے۔ میں ساتھیوں سے کہا کرتا ہوں کہ دوسروں کا بھی کم از کم تعارف تو کروانا چاہیے۔ اس لیے میں نے آپ کو تین چار گروہوں سے متعارف

کرایا ہے کہ وہ بھی اسی حوالے سے کام کر رہے ہیں اور ان سے بھی ہمیں مسائل در پیش ہیں۔ لیکن ہمارا آمنا سامنا اور محاذ آرائی قادیانیت سے ہے اور اعتقادی حوالے سے، سماجی حوالے سے، اور سیاسی حوالے سے ان کے ساتھ ہماری کشمکش چل رہی ہے۔ میں اس کو تین دائروں میں تقسیم کرتا ہوں:

۱. ایک اعتقادی دائرہ ہے جس میں عام طور پر ہمارے مناظرے ہوتے ہیں۔
۲. دوسرا سماجی دائرہ ہے کہ وہ ہمارے درمیان رہتے ہوئے کیسے رہیں گے۔
۳. تیسرا سیاسی دائرہ ہے کہ ان کے سیاسی عزائم کیا ہیں، ان کے بارے میں سیاسی دنیا کا موقف کیا ہے، اور ہمارے ان کے ساتھ کیا تنازعات ہیں، وغیرہ۔ ان تینوں دائروں کو الگ الگ سمجھنا ضروری ہے۔

قادیانیت پر مسلم مناظرین

اعتقادی دائرہ میں تین چار بڑے مسئلے ہیں۔ قادیانیت کے ساتھ جب ہمارا مناظروں کے عروج کا دور تھا، اس میں استاد محترم فاتح قادیان حضرت مولانا محمد حیاتؒ جو مسلمان مناظرین میں سب سے بڑے مناظر تھے۔ باقی سبھی تقریبًا ان کے شاگرد ہیں۔ مثلاً مولانا لال حسین اخترؒ، مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ وغیرہ۔ جبکہ مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری، مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ، علامہ ڈاکٹر خالد محمودؒ، مولانا عبدالرحیم اشعرؒ وغیرہ ہمارے بڑے بڑے مناظرین تھے۔ قادیانیوں میں قاضی نذیر احمد، جلال الدین شمس، ابوالعطاء جالندھری وغیرہ بڑے مناظر تھے۔ ان حضرات کے آپس میں بہت مناظرے ہوئے، ان میں زیادہ تر کونسے مسائل زیر بحث رہتے تھے، وہ ذکر کرتا ہوں:

مرزا غلام احمد قادیانی کا مہدی و مسیح ہونے کا دعویٰ

مرزا قادیانی نے ابتدا یہاں سے کی کہ کہا میں مہدی موعود ہوں۔ امام مہدیؒ کے بارے میں صورتحال یہ بھی ہے کہ جب وہ تشریف لائیں گے سولائیں گے لیکن مہدی کے نام پر سینکڑوں فتنے دنیا میں پیدا ہو چکے ہیں، یہ امرِ واقع ہے۔ مہدی سوڈانی، ملا محمد اٹکی ذکری، مرزا غلام احمد قادیانی، بہاء اللہ شیرازی، مرزا محمد علی باب سب نے مہدیت کے دعوے کیے۔

مہدیت کے حوالے سے اسلام کا حوالہ دینے والوں میں تین بڑے دائرے ہیں:

۱. ایک جمہور اہلِ سنت والجماعت کا دائرہ ہے کہ امام مہدیؒ حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں سے ہوں گے، روایات میں ان کی تفصیلات مذکور ہیں۔

۲. دوسرا دائرہ اہلِ تشیع کا ہے، ان کے ہاں امام مہدی بارہویں امام تھے جو پیدا ہو چکے، اب غائب ہیں، وہ ظاہر ہوں گے۔

۳. اور تیسرا دائرہ ان مہدیوں کا ہے جنہوں نے خود مہدی ہونے کے دعوے کیے۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے پہلے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا، پھر اس نے ایک اور قدم بڑھایا کہ مسلمان حضرت عیسیٰؑ کی تشریف آوری کے بھی منتظر ہیں۔ اس پر قرآن کریم میں اشارات مثلاً ''وانہ لعلم للساعۃ فلا تمترن بہا واتبعون'' (الزخرف ٦١) اور جناب نبی کریمؐ کی واضح پیشین گوئیاں متواتر احادیث میں موجود ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ قیامت کی نشانیوں میں سے ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے یہ جدت کی کہ مہدی اور مسیح دونوں کو اکٹھا کر دیا کہ مہدی اور مسیح ایک شخصیت ہیں۔ اس پر مناظرے اور مکالمے چلتے ہیں۔

اہلِ اسلام کے ہاں مہدی الگ شخصیت ہے، مسیح الگ شخصیت ہے۔ چنانچہ وہ روایت آپ کے سامنے ہوگی کہ امام مہدیؒ دمشق کی جامع مسجد میں فجر کی نماز کی تیاری کر رہے ہوں گے کہ اوپر مینار سے آواز آئے گی کہ میں مسیح ابن مریمؑ ہوں سیڑھی لاؤ، چنانچہ سیڑھی لائی جائے گی اور وہ اتریں گے۔ لیکن مرزا کا دعویٰ یہ ہے کہ مسیح اور مہدی ایک ہی ہے اور وہ میں ہوں۔ اب مسیح ابن مریمؑ بننے کے لیے مرزا کو بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔ اہلِ اسلام کے عقیدے کے مطابق مسیح تو زندہ ہیں، ان پر موت نہیں آئی ''وما قتلوہ وما صلبوہ ولٰکن شبہ لہم'' (النساء ١٥٧) وہ زندہ آسمانوں پر اٹھا لیے گئے، قربِ قیامت اتریں گے۔ اتنے واضح ارشاداتِ نبویؐ ہیں کہ ابہام کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن مرزا نے ابہام پیدا کر دیا۔ مرزا صاحب کا پہلے یہی عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ آسمانوں پر زندہ موجود ہیں، اس کی صراحت مرزا صاحب کی پہلی کتابوں میں موجود ہے۔ لیکن خود مسیح بننے کے لیے یہ عقیدہ گھڑنا پڑا کہ مسیح ابن مریمؑ فوت ہو چکے ہیں۔ چنانچہ مرزائی حضرات مناظرے میں سب سے زیادہ زور اس پر دیتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ فوت ہو گئے ہیں۔ جب کوئی شک میں پڑ جائے یا مان لے تو پھر کہتے ہیں، اب جو آئے گا وہ کون ہو گا؟ وہ مرزا قادیانی ہے۔

اس پر ایک لطیفہ سناتا ہوں۔ ختمِ نبوت کے محاذ پر ہمارے بڑے بزرگوں میں مولانا محمد علی جالندھریؒ تھے۔ ایک دفعہ تقریر میں فرمایا مرزائی لوگ صدق و کذبِ مرزا پر بات نہیں کرتے، حضرت عیسٰی علیہ السلام کی وفات کی بات کرتے ہیں۔ مرزا کا مسیح سے کیا تعلق؟ ایک آدمی نے ان سے پوچھا کہ حضرت عیسٰیؑ زندہ ہیں یا فوت ہو گئے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا تمہیں اس سے کیا فائدہ؟ اگر بالفرض حضرت عیسٰیؑ فوت ہو بھی گئے ہوں تو اس سے یہ نتیجہ کدھر سے نکل آیا کہ مرزا نبی ہے۔ ان کا ایک مستقل مسئلہ ہے کہ حیات ہیں یا نہیں۔ اس پر مولانا ایک کہاوت سنایا کرتے تھے کہ ایک گاؤں میں میراثی کا لڑکا ماں سے پوچھتا ہے کہ ماں! اگر گاؤں کا نمبر دار مر گیا تو پھر نمبر دار کون ہو گا؟ ماں نے کہا کہ پھر اس کا بیٹا نمبر دار ہو گا۔ اس نے پوچھا، وہ بھی مر گیا پھر کون ہو گا؟ ماں نے بتایا پھر اس کا بھائی ہو گا۔ پوچھا، وہ بھی مر گیا تو کون ہو گا؟ ماں نے کہا اس کا بھتیجا ہو گا۔ پوچھا، وہ بھی مر گیا تو کون نمبر دار ہو گا؟ ماں نے کہا، بیٹا میں سمجھ گئی ہوں، سارا گاؤں مر جائے تم نمبر دار پھر بھی نہیں بنو گے۔ یہ سنا کر مولانا کہتے تھے کہ مرزا قادیانی کی نبوت کا حضرت عیسٰی کے مرنے سے کیا تعلق ہے؟ اس سے تمہاری نبوت کہاں سے نکل آئی۔ بہر حال قادیانی حضرت عیسٰیؑ کی وفات کے قائل ہیں اور سری نگر میں ان کی قبر مانتے ہیں۔ اور یہ موضوع رفعِ عیسٰیؑ اور حیاتِ عیسٰیؑ کا ہمارے اور ان کے درمیان مابہ النزاع اور مناظرے کا بڑا موضوع ہے۔

ختمِ نبوت کا عقیدہ

اعتقادی دائرے میں دوسرا مسئلہ یہ زیرِ بحث ہوتا ہے کہ نبوت ختم ہو گئی ہے یا جاری ہے۔ اہلِ سنت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ نبوت اور وحی منقطع ہو چکی ہے، اس پر سینکڑوں احادیث میں واضح ارشادات ہیں کہ میرے بعد نبوت ختم ہو چکی۔ لیکن قرآن کریم کی کچھ آیات سے اشتباہ پیدا کر کے قادیانیوں کا یہ کہنا ہوتا ہے کہ نبوت ختم ہونا ٹھیک بات نہیں، نبوت تو چلتی رہتی ہے، چلتی رہے گی، نبوت اللہ کی رحمت ہے اور اللہ کی رحمت بند نہیں ہوتی۔ ہاں یہ ہو گا کہ جو نبی آئے گا وہ حضورؐ کے تابع ہو گا۔ اہلِ اسلام نے یہ بات تسلیم نہیں کی، نہ مستقل نبی، نہ تابع نبی، کوئی نبی بھی نہیں آسکتا۔

حضورؐ کے زمانے میں دو مستقل نبی کھڑے ہوئے تھے اور ایک تابع نبی کھڑا ہوا تھا۔ اسود عنسی اور طلیحہ اسدی مستقل نبوت کے دعویدار تھے جبکہ مسیلمہ تابع نبی ہونے کا دعویدار تھا۔ مسیلمہ نے

مقابلے کا دعویٰ نبی کریمؐ کی زندگی میں کبھی نہیں کیا، حضورؐ پر ایمان لاتا تھا، آپؐ کی رسالت کا پہلے اقرار لیتا تھا، پھر اپنی رسالت کا اقرار کراتا کہ میں بھی ان کی پیروی میں نبی ہوں۔ حضورؐ نے اس کے دعوے کو، کہ آپؐ کی پیروی میں نبی ہوں، مسترد کر دیا اور طلیحہ اسود کا مستقل نبی ہونے کا دعویٰ بھی رد کر دیا۔ لیکن قادیانی اشتباہ اور دجل کے امام ہیں ایسا دجل اور شبہ ڈالتے ہیں کہ اچھا خاصا پڑھا لکھا آدمی بھی پریشان ہو کر رہ جاتا ہے۔

متفرق مسائل

اس کے علاوہ یہ بھی گفتگو کا میدان ہے کہ کشف اور الہام، جس کو اہلِ اسلام بھی مانتے ہیں، بہت سے صوفیاء نے کشف و الہام کی باتیں کی ہیں، اس کو قادیانی وحی کی قسم بتلاتے ہیں کہ ان کو الہام ہو سکتا ہے تو مرزا پر وحی بھی آسکتی ہے۔

ہمارے مناظرین کا یہ کہنا ہوتا ہے کہ نبی بننے کے لیے جو معیار درکار ہے مرزا اس معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں اترتا۔ صدق و کذبِ مرزا پر بات کرتے ہیں۔ نبوت کا پہلا معیار ہی یہ ہے کہ حضورؐ نے مکہ والوں سے پوچھا ''هل وجدتمونی صادقًا او کاذبًا؟'' اپنے آپ کو پیش کیا۔ جبکہ مرزا دجل اور فریب کا امام تھا، تو مرزا اپنی تحریرات کے حوالے سے نبوت کا اہل ہے یا نہیں، اسی کو دیکھ لیں۔ کردار اور گفتگو کے حوالے سے دیکھ لیں۔

اس کے علاوہ ایک موضوع یہ ہوتا ہے کہ مرزا کی کتابوں میں کئی انبیاء کرامؑ کی گستاخی کی گئی ہے، اور نبی کی گستاخی خود کفر ہے اور وجوہِ کفر میں سے ہے۔

پارلیمنٹ کے ذریعے قادیانیوں کی تکفیر

یہ دائرہ اعتقادی دائرہ ہے۔ اس پر کتابیں، مناظرے اور مکالمے ہر سطح پر ہوتے رہتے ہیں۔ اس پر ایک مکالمے کا ذکر کرتا ہوں۔

جب ۱۹۷۴ء میں قومی اسمبلی میں یہ بل پیش ہوا کہ قادیانیوں کو دستور میں غیر مسلموں میں شمار کیا جائے تو بھٹو مرحوم نے کہا کہ یکطرفہ فیصلہ نہ کرو بلکہ قادیانیوں کو بھی بلا لو، ساری بات آمنے سامنے کر لو تاکہ کوئی کل یہ نہ کہہ سکے کہ تم نے فیصلہ یکطرفہ کیا تھا۔ بھٹو نے یہ اچھی بات کہی۔ بھٹو مرحوم کی کئی

باتوں سے مجھے اختلاف ہے لیکن بھٹو کی جن باتوں کو میں سمجھداری کی باتیں سمجھتا ہوں ان میں سے ایک یہ بات بھی ہے کہ بھٹو نے کہا کہ حکومتی فیصلہ نہ کراؤ، پارلیمنٹ سے فیصلہ لے لو تا کہ کوئی اعتراض نہ کر سکے۔ مجھ سے فیصلہ کرانا ہے تو میں کر دیتا ہوں لیکن بہتر ہے پارلیمنٹ سے فیصلہ کراؤ تا کہ آج کے معیار کے مطابق قومی فیصلہ شمار کیا جائے۔

قادیانیوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک قادیانی، دوسرا لاہوری۔ قادیانیوں کے سربراہ مرزا ناصر احمد اور لاہوریوں کے سربراہ تھے مولوی صدر الدین۔ دونوں کو بلایا گیا۔ گیارہ دن تک مرزا ناصر احمد نے قومی اسمبلی کے ارکان سے بحث کی۔ تین دن مولوی صدر الدین نے بحث کی۔ صفائی کا پورا موقع دینے کے بعد فیصلہ کیا گیا۔ اس میں مسلمانوں کی طرف سے بحث مباحثہ کرنے والوں میں پیش پیش یہ حضرات تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ اور سرکاری طور پر جناب یحییٰ بختیار مرحوم جو اٹارنی جنرل تھے سب سے زیادہ بحث انہوں نے کی تھی۔

لیکن یہ بات حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے ہمیں ایک موقع پر جمعیت کی شوریٰ کی میٹنگ میں بتائی کہ اس مباحثے کے دوران، جو چودہ دن چلتا رہا ہے، ایک دن بھٹو صاحب نے مجھے کہا کہ مفتی صاحب! بات الجھتی جا رہی ہے، آپ بھی قرآن کی آیتیں پڑھتے ہیں، وہ بھی آیتیں پڑھتے ہیں، بیسیوں آیات سے استدلال کرتے ہیں، وہ خاتم کا معنیٰ کچھ اور کرتے ہیں، آپ کچھ اور کرتے ہیں، حدیثیں وہ بھی پڑھتے ہیں، آپ بھی پڑھتے ہیں، وہ بھی لغت کی کتابوں کے حوالے دیتے ہیں، آپ بھی دیتے ہیں۔ ہم لوگ (جو دینی علم نہیں رکھتے ان بحثوں کو نہیں جانتے) کنفیوژ ہو رہے ہیں۔

آپ سے عرض کروں کہ قادیانیوں کی سب سے بڑی تکنیک یہی ہوتی ہے کہ سامنے والے کو کنفیوژن میں ڈال دو کہ وہ الجھا ہی رہے اور کسی نتیجے پر نہ پہنچے۔ ہر مسئلہ میں شک پیدا کرنا اور الجھانا ان کا کام ہوتا ہے۔ عام آدمی حتیٰ کہ عام عالمِ دین جو قادیانیت کے لٹریچر سے واقف نہیں ہے، ان کے طریقۂ واردات سے واقف نہیں ہے، اگر وہ بحث مباحثہ کرے گا تو وہ بھی کنفیوژن کا شکار ہو جائے گا۔ جس کی قادیانیت کی تاریخ، لٹریچر اور طریقۂ واردات پر گہری نظر ہو گی، وہی بحث مباحثہ کر سکتا ہے، دوسرا تو خود کنفیوژ ہو جائے گا۔

تو بھٹو مرحوم نے کہا کہ قرآن سے کوئی واضح آیت بتائیں جس میں ہو کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں

ہے۔ مولانا مفتی محمودؒ کہتے تھے کہ ایک دفعہ تو میں بھی چکرا گیا کہ یہ کیا ہوا۔ اگر اسمبلی کا لیڈر کنفیوژ ہو گیا ہے تو پھر ساری اسمبلی کنفیوژ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ذہن میں بات ڈالی۔ میں نے کہا قرآن کریم کی پہلی سورت کے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے یہ مسئلہ حل کر دیا ہے اور فرمادیا ہے کہ ''والذین یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالاخرۃ ھم یوقنون'' (البقرہ ٤)۔ متقین اور مومنین وہ ہیں جو اس وحی پر ایمان لاتے ہیں جو آپ پر نازل ہوئی ہے اور جو آپ سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اگر بعد میں بھی وحی آنی ہوتی تو ''ومن بعدک'' بھی فرمایا جاتا۔ بھٹو صاحب کو بات سمجھ آگئی کہ قرآن کہتا ہے وحی حضورؐ سے پہلے ہی ہے، بعد میں نہیں ہے۔ بہر حال یہ اعتقادی دائرہ ہے اس قسم کے مسائل پر مناظرہ مباحثہ مکالمہ چلتا رہا لیکن اب قادیانیوں نے ایک عرصہ سے مناظرے کا میدان چھوڑ رکھا ہے۔

مباہلے کا میدان

ایک میدان مباہلے کا ہے جو مرزا غلام احمد قادیانی نے خود چھیڑا تھا۔ مباہلے کے چیلنج کرتا رہا، کبھی عیسائی پادریوں کو، کبھی مسلمان علماء کو۔ اس کا ایک بڑا مشہور مباہلے کا چیلنج ہے، حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری جو اہلِ حدیث اور اکابر علماء میں سے تھے، شیخ الہندؒ کے شاگردوں میں سے اور جمعیت علماء ہند کے بانیوں میں سے ہیں۔ جمعیت علماء ہند کا تاسیسی اجلاس امرتسر میں ان کے گھر میں ہوا تھا۔ ان کا بڑا میدان مناظرہ کا تھا، بہت زبردست مناظر تھے، آریہ سماج ہندوؤں کے خلاف بھی، عیسائیوں کے خلاف بھی، قادیانیوں کے خلاف بھی، اور حنفیوں کے خلاف بھی بڑے مناظر تھے۔ محدثِ گوجرانوالہ حضرت مولانا عبد العزیزؒ اور مولانا امرتسری کا فاتحہ خلف الامام پر مشہور مناظرہ ہے۔ تحریری مناظرہ چھپا ہوا ہے جس میں دونوں نے حکم مولانا سید سلیمان ندویؒ کو مانا تھا اور سید سلیمان ندویؒ نے فیصلہ دیا تھا کہ اس میں مولانا عبد العزیز صاحبؒ کا موقف ٹھیک ہے۔

مرزا سے بھی مولانا امرتسریؒ کی نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ امرتسر سے ان کا پرچہ نکلتا تھا۔ مرزا نے ان کو مباہلے کا چیلنج دے دیا اور کہا اگر مولوی ثناء اللہ سچا ہے تو میں اس کی زندگی میں اتنے عرصے کے اندر ذلت کی موت مر جاؤں، اور اگر میں سچا ہوں تو مولوی ثناء اللہ میری زندگی میں اتنے عرصے

کے اندر ذلت کی موت مر جائے۔ اس پر اشتہار چھاپے، کتابیں چھاپیں، دنیا میں ڈھنڈورا پیٹا کہ مولوی ثناء اللہ کی خیر نہیں ہے۔ اس چیلنج کے ایک سال کے اندر مرزا غلام احمد قادیانی صاحب لاہور میں بیت الخلا میں فوت ہو گئے، جبکہ مولانا امرتسری اس کے بعد چالیس سال تک حیات رہے۔

پھر مباہلے کا ایک اور میدان سامنے آیا۔ حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ پاکستان بننے کے بعد چنیوٹ کے رہنے والے تھے۔ چنیوٹ کے قریب ربوہ میں قادیانیوں نے اپنا مرکز بنالیا۔ مولانا چنیوٹیؒ حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور مولانا بدر عالمؒ کے شاگرد تھے۔ بڑے مناظر اور متکلّم قسم کے بزرگ تھے۔ ہمارا تو زندگی بھر ساتھ رہا ہے، کم و بیش چالیس سال ہم نے اکٹھے کام کیا ہے۔ انہوں نے مباہلے کا ایک نیا رخ اختیار کیا۔ ۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ء کی بات ہے کہ مرزا بشیر الدین محمود قادیانیوں کے سربراہ تھے جو مرزا غلام احمد کے بیٹے تھے، ربوہ آ گئے تھے۔ مولانا چنیوٹیؒ نے مرزا بشیر الدین محمود کو چیلنج دے دیا کہ مناظرے چھوڑو، دریائے چناب کے اس طرف آپ رہتے ہیں، اس طرف میں رہتا ہوں، درمیان میں ایک خشک پٹی ہے، وہاں دونوں جمع ہوتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہم میں سے جو جھوٹا ہے اسے برے انجام کا شکار کر۔

قادیانیوں کی طرف سے کہا گیا کہ تم ایک عام مولوی ہو، کس کے نمائندے ہو؟ اس وقت کی چار بڑی جماعتوں جمعیت علماء اسلام، مجلسِ تحفظِ ختم نبوت، تنظیم اہلِ سنت، اور جمعیت اشاعۃ التوحید والسنۃ کے بڑے بزرگوں، جمعیت علماء اسلام کے ناظمِ اعلیٰ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ، تحفظِ ختم نبوت کے ناظمِ اعلیٰ مولانا محمد علی جالندھریؒ، تنظیمِ اہلسنت کے امیر حضرت مولانا نور الحسن شاہ بخاریؒ، اور جمعیت اشاعۃ التوحید والسنۃ کے قائد حضرت مولانا غلام اللہ خان سے لکھوایا کہ یہ ہمارا نمائندہ ہے، اس کی فتح و شکست ہماری فتح و شکست ہو گی۔ اس وقت دیوبندیوں کے دائرے میں بڑی جماعتیں یہی تھیں۔ مولانا چنیوٹیؒ نے اس کے بعد اعلان کیا کہ میں سب کا نمائندہ ہوں، سب سے نمائندگی لے لی ہے، تاریخ مقرر کی، دریائے چناب کے درمیان خشک پٹی پر گئے، سارا دن انتظار کرتے رہے لیکن مرزا بشیر الدین محمود صاحب نہیں آئے۔ اس کے بعد مولانا چنیوٹیؒ کا ہر سال معمول رہا کہ ۲۶ فروری کو باقاعدہ اعلان دہراتے، اشتہار چھاپتے اور وہاں جاتے۔ اب ان کے بعد مولانا محمد الیاس چنیوٹیؒ جاتے ہیں اور فتح مباہلہ کانفرنس بھی ہوتی ہے۔ یہ بھی مباہلہ کا دائرہ ہے جو چلا آ رہا ہے۔

ایک دائرہ مباہلہ کا اور تھا۔ مرزا طاہر احمد نے، جو سربراہ بنے مرزا ناصر احمد کے بعد، دنیا بھر کے بڑے بڑے مسلم علماء کو دعوت دی مباہلہ کی، کہ اللہ جھوٹے کا جھوٹ ظاہر کر دے۔ کتابچہ چھاپ کر دنیا کے مشہور علماء کو بھیجا، مجھے بھی بھیجا گیا۔ میں اس وقت جمعیت علماء اسلام پاکستان کا سیکرٹری اطلاعات اور مشترکہ مجلسِ عمل تحفظِ ختمِ نبوت کا رابطہ سیکرٹری تھا، مجھے لندن سے رجسٹری ڈاک کے ذریعے وہ کتابچہ ملا۔ میں بھی اس کے مباہلہ کے مخاطبین میں تھا۔ اس کے جواب میں نے تفصیلی خط لکھا جو روزنامہ جنگ لندن اور ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور میں چھپا، اب اس کی دوبارہ اشاعت ہوئی ہے۔ اس وقت مباہلہ قبول کرنے کا اعلان جن شخصیات نے کیا ان میں مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ، پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری اور مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت کے ناظمِ اعلیٰ حضرت مولانا عزیز الرحمٰن جالندھری دامت برکاتہم تھے۔ مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ نے مباہلہ قبول کرتے ہوئے اعلان کیا کہ لندن آرہا ہوں، وہاں مباہلہ کریں گے۔ میں نے خط لکھا کہ مجھے چیلنج قبول ہے، ہمارے ان تین حضرات نے مباہلہ قبول کیا ہے، ان میں سے جس کی دعوت آپ قبول کریں گے مجھے آپ ان کے ساتھ موجود پائیں گے۔ اس پر قادیانی تاویلیں کرنے لگے کہ مباہلے کا یہ مطلب نہیں تھا، ہم نے بھی لکھ دیا آپ نے بھی لکھ دیا، بس کافی ہے، میدان میں آنا ضروری نہیں ہے۔

لندن میں ہائیڈ پارک، جو لندن کے وسط میں بہت بڑی پارک ہے، اس کا ایک کونہ ہے جو ہائیڈ پارک کارنر کہلاتا ہے، یہ کونہ قانون سے بالاتر سمجھا جاتا ہے گفتگو کے حوالے سے۔ وہاں جو کوئی جو کچھ کہنا چاہے کہے، کوئی ایکشن نہیں لیا جاتا۔ کوئی خدا کے خلاف بات کرے یا رسول کے خلاف کرے، جو چاہے کہے۔ شام کو بڑا عجیب منظر ہوتا ہے کہ مختلف ٹولیوں میں لوگ کھڑے ہوتے ہیں۔ ہر ٹولی میں ایک ایک آدمی اپنی بھڑاس نکال رہا ہوتا ہے۔ پریشر ککر کی طرح غصہ نکال کر ٹھنڈے ہو کر گھر چلے جاتے ہیں۔ مولانا چنیوٹیؒ نے کہا میں فلاں تاریخ کو ہائیڈ پارک کارنر آرہا ہوں تم بھی آجاؤ، مرزا طاہر بھی لندن میں تھے لیکن وہ نہیں آئے۔ مولانا چنیوٹیؒ اپنے ساتھیوں سمیت ایک نہیں دو دفعہ وہاں گئے۔ بہرحال مباہلے کا ایک دائرہ یہ ہے۔

حسن عودہ کا قبولِ اسلام

اس کے نتیجے کے طور پر ایک بات عرض کروں گا کہ مرزا طاہر احمد کے سیکرٹری تھے فلسطینی

نوجوان حسن عودہ، اس کے نانا قادیانی ہوئے تھے۔ اس کا خاندان قادیان آگیا تھا۔ حسن عودہ کی پرورش قادیان میں ہوئی، یہ قادیانیوں کے عربی جریدے کے ایڈیٹر تھے۔ میں نے ان سے انٹرویو کیا ہے۔ یہ اس زمانے میں مسلمان ہوگئے، دوست ہیں، میں نے ان کو کہا ''حَسُنَ عَوْدُہ''۔ انہوں نے لندن میں مولانا چنیوٹیؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور ویمبلے کانفرنس میں تقریر کی اور کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ میں مرزا ناصر احمد کی دعوت مباہلہ کا پہلا ثمرہ ہوں ''انا اول ثمرة المباهلة'' کہ اسے چھوڑ کر اسلام قبول کر رہا ہوں۔

قادیانیوں کے ساتھ سماجی معاملہ

سماجی دائرہ میں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا تو اسے بہت پیروکار ملے۔ جماعت احمدیہ کا پھیلاؤ ہوا۔ انگریزوں کا زمانہ تھا۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ وہ ہمارے درمیان رہتے ہیں، حکومت ہماری نہیں ہے، مسلم حکومت ہوتی تو معاملات نمٹ چکے ہوتے۔ یہ مسئلہ کیوں پیدا ہوا، یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ مسئلہ جب پیدا ہوا حکومت غیر مسلموں (انگریزوں) کی تھی، فیصلہ کرنے والی اتھارٹی غیر مسلم تھی۔ ہم غیر مسلموں کے تحت تھے، اب قادیانیوں کے ساتھ معاشرتی برتاؤ کیا ہوگا؟ یہ نیا مسئلہ کھڑا ہوگیا تھا۔ ہمارے غلبے کے دور کے مسائل کی نوعیت اور ہے اور مغلوبیت کے دور کے مسائل کی نوعیت اور ہوتی ہے۔ بہت سے مسائل میں ہمیں اس وجہ سے نیا رخ اختیار کرنا پڑا۔ جبکہ ہماری فقہ کی ترتیب و تدوین غلبے کے دور کی ہے جہاں ہمارا اپنا معاشرہ ہو، ہماری حکومت اور ہمارا نظام ہو۔ مگر پچھلے دو تین سو سال میں ہمیں یہ بھی پیش آیا کہ ہم مغلوب ہوگئے، بحیثیت قوم غلام ہوگئے، حالات متغیر ہوگئے۔ اب یہ نئی بات تھی کہ غیر مسلموں کے غلبے میں ان کے ماتحت وقت گزاریں گے تو کیسے؟ اس کے نئے تقاضے پیدا ہوگئے، اس سے بیسیوں مسائل پیدا ہوئے۔

مثلاً ایک مسئلہ یہ کہ احناف کے ہاں جمعہ کے انعقاد کی شرائط میں ''سلطان او نائبه'' شرط ہے۔ اب سلطان تو ختم ہوگیا، غیر مسلم سلطان بن گئے، اب کیا کریں؟ بعض حضرات نے جمعہ ساقط کر دیا کہ اب جمعہ فرض ہی نہیں ہے، جمعہ کی جگہ ظہر پڑھنے کا حکم دیا۔ لیکن پورے برصغیر میں جمعہ مستقل

معطل کر دینا امت کے اجتماعی مفاد کے خلاف تھا۔ اس وجہ سے ہم نے مسلم سلطان کے آنے تک اس شرط میں تبدیلی کی اور مسجد کے نمازیوں کی اجتماعی رائے کو ''سلطان او نائبہ'' کا قائمقام قرار دیا۔ جس کے امام اور خطیب ہونے پر نمازی متفق ہوں وہی سلطان کا نائب ہے۔ اس سے یہ شرط پوری ہو جاتی ہے اور جمعے کو تعطل کا شکار نہیں ہونے دیا۔ اسی حوالے سے ہمارے بعض مفتیان کرام کا فتویٰ چلا آرہا ہے اور عمل بھی ہوتا ہے کہ چونکہ ہم ایک بڑی شرط کے بغیر مجبوری کے تحت جمعہ پڑھ رہے ہیں اس لیے جمعہ بھی پڑھا جائے اور ظہر احتیاطی بھی پڑھی جائے۔ ظہر احتیاطی کا بھی پس منظر ہے۔ مولانا احمد رضا خانؒ کا فتویٰ یہی ہے۔ غلبے کے دور میں نوعیت اور تھی اور مغلوبیت کے دور میں نوعیت اور تھی۔

علامہ محمد اقبالؒ کی تجویز

بالکل یہی صورتحال ہمیں قادیانیت کے حوالے سے پیش آئی، غلبے کے دور میں مدعیانِ نبوت اور ان کے پیروکاروں سے نمٹنا حکومت کا کام تھا لیکن مغلوبیت کے دور میں کس نے کیا کرنا تھا اور اب معاملہ کیا ہوگا؟ اس پر علامہ محمد اقبالؒ کی تجویز یہ تھی اور انہوں نے انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ قادیانی ہمارے ساتھ معاشرے میں رہیں لیکن انہیں ہمارے ساتھ شمار نہ کیا جائے، ان کو غیر مسلم گروہ کے طور پر ڈیل کیا جائے۔ یہ بات سب سے پہلے علامہ محمد اقبالؒ نے کہی تھی کہ ان کے عقائد ہمارے عقائد سے مختلف ہیں جن کی وجہ سے یہ مسلمان نہیں ہیں، اگرچہ مسلمان کہلاتے ہیں، اس لیے ان کو غیر مسلم اقلیت کے طور پر ڈیل کیا جائے۔ جب اقبالؒ نے یہ کہا کہ قادیانی مسلمان نہیں ہیں تو اس پر اقبالؒ کا پنڈت جواہر لال نہرو سے مکالمہ بھی ہوا۔ نہرو نے کہا، قادیانی کلمہ پڑھتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، کعبے کو مانتے ہیں، قرآن بھی پڑھتے ہیں، پھر مسلمان کیوں نہیں ہیں؟ انگلش مکالمہ تھا، اب اردو میں چھپ گیا ہے۔ قادیانیت کو آج کے سماجی تناظر میں سمجھنے کے لیے سب سے بہتر مکالمہ ان دونوں کا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات سے میں کہا کرتا ہوں کہ اگر ہماری باتیں آپ کو سمجھ نہیں آ رہیں تو اقبالؒ کو پڑھ لو۔ اقبالؒ آپ کو سمجھا دے گا کہ قادیانی مسلمان کیوں نہیں ہیں۔ لیکن جب پاکستان بنا تو اس کی نوعیت پھر بدل گئی، اب سابقہ پوزیشن (مسلم حکومتوں والی) پر واپس جانا ہے یا اس پوزیشن (انگریز کے دور والی) پر رہنا ہے؟

۱۹۵۳ء میں تمام مکاتبِ فکر کے اکابر علماء کرام نے ایک اجماعی اور اجتہادی فیصلہ کیا۔ میں اسے پاکستان کے علماء کا بڑا اجماعی اور اجتہادی فیصلہ کہا کرتا ہوں۔ انہوں نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ قادیانیوں کو پاکستان میں غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ چنانچہ طویل تحریک کے بعد ۱۹۷۴ء میں دستور میں یہ فیصلہ ہوا اور اس وقت سے قادیانی غیر مسلم اقلیت کے طور پر چلے آ رہے ہیں۔

آج میں نے قادیانیت کے حوالے سے دو دائرے ذکر کیے ہیں:

۱. پہلا اعتقادی دائرہ جس میں مناظرے کا میدان اور مباہلہ کا میدان ہے۔
۲. اور دوسرا سماجی دائرہ جس میں اقبالؒ کی تجویز، اقبالؒ اور نہرو کا مکالمہ، اور پاکستان کے علماء کا اجماعی فیصلہ ہے۔
۳. اس کے بعد تیسرا دائرہ سیاسی دائرہ ہے جو آج کل زیر بحث ہے اور تفصیل کا متقاضی ہے۔

ضمیمہ

مذہب کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر

مطالعۂ مذاہب کے حوالہ سے گفتگو کرتے ہوئے ہمیں سب سے پہلے اس بات کو دیکھنا ہے کہ ہم جس ماحول اور تناظر میں بات کر رہے ہیں اس میں مذہب اور دین کے بارے میں کیا سمجھا جا رہا ہے اور اس کے حوالہ سے لوگوں کے نظریات و افکار کیا ہیں؟ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کا اولین خطاب چونکہ عرب سوسائٹی سے تھا اور ان مذاہب و ادیان کے ساتھ ان کا مکالمہ تھا جس سے اسے سابقہ درپیش تھا اس لیے قرآن کریم نے عام طور پر یہود و نصاریٰ، مشرکین اور صابئین وغیرہ کو سامنے رکھ کر عقائد میں مجادلہ کیا ہے۔ اور اگرچہ اصولی طور پر پوری نسل انسانیت کے دائرہ میں قرآن کریم نے عقائد بیان کیے ہیں لیکن مناظرہ و مجادلہ انہی مذاہب کے ساتھ رہا ہے جو اس وقت مسلمانوں کے سامنے تھے۔

لیکن آج کا تناظر اس سے مختلف ہے اور اصولی طور پر دنیا بھر کے مذاہب سے خطاب کے ساتھ ساتھ ابلاغ کے متنوع اور وسیع ذرائع نے عملی طور پر بھی پوری نسل انسانی کو ہمارا یکساں مخاطب بنا دیا ہے۔ چنانچہ دنیا کے کسی ایک حصے میں کہی جانے والی بات چند لمحوں میں دنیا کے دوسرے کنارے تک پہنچ جاتی ہے اور کوئی داعی دنیا کے مجموعی ماحول کو سامنے رکھے بغیر اپنی بات صحیح طور پر نہیں کہہ سکتا۔ اس لیے ہمیں مذاہب و ادیان کا مطالعہ کرتے ہوئے یا ان کے بارے میں بحث و تمحیص کرتے ہوئے کم و بیش سات ارب انسانوں پر مشتمل انسانی سوسائٹی کے مجموعی تناظر کو سامنے رکھنا ہوگا اور دین و مذہب کے بارے میں ان تمام افکار و مذاہب کے بارے میں معلوم کرنا ہوگا جن کے پیروکار اس وقت معاصر دنیا میں ہمارے ساتھ رہ رہے ہیں۔

۱. آج کی گلوبل انسانی سوسائٹی کو سامنے رکھ کر آپ دین و مذہب کی بات کریں گے تو آپ کو سب سے پہلے انسانوں کی ایک بہت بڑی آبادی سے سابقہ درپیش ہوگا جو سرے سے مذہب کے قائل نہیں ہیں اور خدا اور آخرت پر ان کا یقین نہیں ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ دنیا ہی سب کچھ ہے، اس سے آگے پیچھے اور کوئی جہان نہیں ہے، موت کے بعد انسان فنا

کے گھاٹ اتر کر معدوم ہو جاتا ہے جس کے بعد نہ کوئی زندگی ہے اور نہ کوئی سزا و جزا کا نظام موجود ہے۔ ایسے لوگ دنیا میں کم تعداد میں نہیں ہیں بلکہ آج کی گلوبل انسانی سوسائٹی میں ایسے افراد کی بہت بڑی تعداد موجود ہے اور وہ اپنے عقیدہ کو چھپانے کی بجائے اس کا کھلم کھلا اظہار کرتے ہیں بلکہ خدا اور آخرت پر یقین رکھنے والوں کا مذاق بھی اڑاتے ہیں۔

۲. دین و مذہب کے بارے میں دوسرا نقطۂ نظر آپ کو یہ ملے گا کہ انسانی سوسائٹی کے لیے مذہب کی افادیت سے انکار نہیں ہے بلکہ یہ انسانی اخلاق وعادات کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن اس کا وجود خارجی نہیں ہے کہ انسان کو باہر سے کوئی ہدایات ملی ہوں یا غیب سے اس کی کوئی رہنمائی ہو رہی ہو بلکہ مذہب انسان کا خود اپنا پیدا کردہ ہے کہ ہر دور میں کچھ اربابِ فکر و دانش نے اس دور کی نفسیات و رجحانات کو سامنے رکھ کر چند عقائد، عبادات اور اخلاقیات کا ایک نظام تخلیق کیا تاکہ اس کو سامنے رکھ کر لوگ اپنی عادات و عبادات اور اخلاقیات و سماجیات کو ایک دائرے میں محدود رکھ سکیں۔ اس طرح انسانی نفسیات کے اتار چڑھاؤ اور تنوع کو دیکھ کر بعض مفکرین اور ریفارمرز نے مذاہب تخلیق کیے اور رفتہ رفتہ انہوں نے باقاعدہ مذاہب کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس مکتب فکر کا کہنا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام دراصل مصلحین اور ریفارمرز تھے جنہوں نے اپنے دور کی ضروریات سامنے رکھ کر کچھ اصول وضع کیے اور انہیں مذہب کی حیثیت دے دی، انہوں نے اپنی بات منوانے اور انسانوں کو متاثر کرنے کے لیے یہ تاثر دیا کہ یہ تعلیمات وہدایات ان کی اپنی نہیں ہیں بلکہ غیب سے انہیں یہ ہدایات ملی ہیں تاکہ وہ نسلِ انسانی کی راہنمائی کر سکیں۔ اس مکتب فکر کے نزدیک سزا و جزا اور جنت و جہنم کے بارے میں حضرات انبیاء کرامؑ کے ارشادات کا درجہ بھی یہی ہے کہ انسانوں کو اچھے اعمال کی طرف راغب کرنے اور برے اعمال سے روکنے کے لیے یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے، جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو بات مان لینے پر مٹھائی کا لالچ دیتی ہے اور بات نہ ماننے پر کسی انجانی بلا سے ڈراتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ نے بھی (نعوذ باللہ) انسانی نفسیات کو سمجھتے ہوئے سزا و جزا کی باتیں بیان فرمائی ہیں، اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب مذہب کی حیثیت محض ایک

نفسیاتی حربے کی ہوگی اور اس کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوگا تو یہ ہر زمانے اور ہر ماحول کے لیے مختلف ہوگا اور وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ اس کے دائرے بھی بدلتے جائیں گے۔ اسی وجہ سے یہ طبقہ مذہب کے کسی متعیّنہ دائرے میں پابند ہونے یا کچھ طے شدہ قواعد واصول پر جم جانے کو درست نہیں سمجھتا اور مسلسل تبدیلیوں پر زور دیتا ہے۔

۳۔ دین ومذہب کے بارے میں انسانی سوسائٹی میں آپ کو تیسرا نقطۂ نظر یہ ملے گا کہ مذہب کوئی نفسیاتی حربہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی راہنمائی کے لیے آنے والی ہدایات کا نام ہے جو حضرات انبیاء کرامؑ کے ذریعے نازل ہوئیں اور آسمانی وحی اور کتابوں کی صورت میں انسانی سوسائٹی کی راہنمائی کا اہتمام کیا گیا۔ لیکن اس کا ایک وقت محدود تھا جب اس کی ضرورت تھی، جس طرح ایک بچے کو بلوغت تک ماں باپ کی راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ہدایات اور راہنمائی کا محتاج ہوتا ہے لیکن جب وہ بلوغت کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اس ضرورت سے بے نیاز ہوجاتا ہے اور عاقل وبالغ ہونے کے بعد اپنے فیصلے خود کرنے لگ جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی سوسائٹی کو ایک وقت تک وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کی ضرورت تھی اور وہ خارجی راہنمائی کی محتاج تھی لیکن اب جبکہ انسانی سوسائٹی بالغ ہوگئی ہے اور اپنا برا بھلا خود سمجھنے لگی ہے تو اسے بیرونی ہدایات کی ضرورت نہیں رہی اور وہ اس حیثیت میں ہے کہ اپنے فیصلے خود کرے اور اپنے نفع ونقصان کا خود جائزہ لے۔

۴۔ جبکہ دین ومذہب کے بارے میں چوتھا نقطۂ نظر وہ ہے جو اکثر اہلِ مذاہب کا ہے اور خود ہمارا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے نسلِ انسانی کی راہنمائی کے لیے ہدایات بھجوائی ہیں، اس دنیا کے بعد اگلی زندگی میں سزا وجزا کے نظام سے آگاہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے اس میں جو اعمال ہوں گے اس کے مطابق اگلی زندگی کا فیصلہ ہوگا۔ حضرات انبیاء کرامؑ کی یہ تعلیمات خودساختہ نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر نازل ہوئی ہیں اور یہ وقت گزرنے کے ساتھ منسوخ نہیں ہوئیں بلکہ آج بھی واجب العمل ہیں اور قیامت تک واجب العمل رہیں گی۔

یہ چند چیدہ چیدہ رجحانات ہیں جو آج کی گلوبل انسانی سوسائٹی میں دین ومذہب کے حوالہ سے

پائے جاتے ہیں اور مذہبی مباحثات و مکالمات کا دائرہ ان کے گرد گھومتا ہے۔ آج جب ہم مذہب کے حوالہ سے بات کریں گے تو ان رجحانات کو سامنے رکھنا ہوگا اور وسیع تناظر میں بات کرنا ہوگی۔ جبکہ ہمارے ہاں مذہب کے بارے میں بات چیت کا دائرہ بہت محدود ہے اور عقائد کے مباحثات اسی محدود دائرے میں ہوتے ہیں۔ ہمارے مدارس میں علم الکلام اور عقائد کے شعبہ میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اور جو بحثیں ہوتی ہیں ان کی ضرورت و اہمیت سے انکار نہیں ہے اور وہ بہت ضروری ہیں، خاص طور پر قرونِ اولیٰ میں اہل السنۃ والجماعۃ کے ساتھ گمراہ فرقوں کے اعتقادی مباحث کی نوعیت اور اسی تناظر میں اہلِ سنت کے عقائد و تعبیرات کو اس کے بغیر سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن ہمیں اس حقیقت کا بھی ادراک کرنا چاہیے کہ عقیدہ و تعبیر کی بحث اور جدل و کلام کا یہ دائرہ آج کے دور کے لیے کافی نہیں ہے اور ہمیں آج کے تقاضوں کو علم الکلام کے نصاب اور اعتقادات کے مباحث میں شامل کرنا ہوگا، اس کے بغیر اس شعبہ میں ہم اپنی ذمہ داریوں سے صحیح طور پر عہدہ برآ نہیں ہو سکیں گے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۴ اپریل ۲۰۱۰ء)

مذاہب اور مذہبی اکابر کی اہانت کا مسئلہ

سہ روزہ دعوت دہلی کی یکم اپریل ۲۰۰۹ء کی اشاعت میں بتایا گیا ہے کہ:

”جنیوا میں تقریباً ۲۰۰ افراد اور میڈیا گروپوں سے وابستہ دانشوروں نے اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی کونسل سے کہا ہے کہ وہ اسلامی ممالک کی جانب سے پیش کی گئی اس تجویز کو مسترد کر دے جس میں انہوں نے عالمی پیمانے پر ایسا قانون تیار کرنے کی مانگ کی ہے جس کے ذریعے مذہبی رہبروں اور مختلف ادیان کی اہانت سے لوگوں کو روکا جا سکے۔ واضح رہے کہ ۵۶ مسلم ممالک پر مشتمل او آئی سی کی جانب سے پاکستان نے مذکورہ تجویز میں مطالبہ کیا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں پر روزانہ انسانی حقوق کی پامالی اور دہشت گردی کے جھوٹے اور من گھڑت الزام لگائے جا رہے ہیں اس لیے یہ لازمی ہے کہ مذہب کی اہانت اور فرقہ وارانہ جذبات بھڑکانے والی ایسی حرکتوں پر لگام کسی جائے۔“

جہاں تک مذاہب اور ان کی بڑی شخصیات کے احترام کا تعلق ہے، یہ بین الاقوامی مسلّمات اور اخلاقیات کا حصہ ہے کہ ایک دوسرے کے مذہب کا اور اس کی بزرگ شخصیات کا احترام کیا جائے اور ان کی توہین کر کے ان کے ماننے والوں کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچائی جائے، حتیٰ کہ قرآن کریم نے مشرکین کے باطل معبودوں کو بھی برا بھلا کہنے سے منع کیا ہے تاکہ ردعمل میں وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدزبانی نہ کریں۔ لیکن دنیا کے مذہب دشمن عناصر ایک عرصہ سے اپنی مذہب دشمنی کے باعث اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ مذہبی شخصیات اور مذاہب کا احترام لوگوں کے دلوں سے نکال دیا جائے اور انہیں مسلسل نفرت اور تمسخر کا نشانہ بنایا جاتا رہے۔

چونکہ دنیا بھر کے مسلمان اپنے مذہب اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سمیت آسمانی مذاہب کی بزرگ شخصیات کے ساتھ بے پناہ محبت و عقیدت رکھتے ہیں اور وہ ان کی کسی بھی درجہ میں توہین برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اس لیے وہی مذہب دشمن عناصر کا سب سے زیادہ ہدف بنتے

ہیں۔ اس لیے او آئی سی (اسلامی سربراہ کانفرنس) کا یہ مطالبہ بالکل درست ہے اور اقوام متحدہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس اصولی اور فطری مطالبہ کو منظور کر کے قانون سازی کرے۔ البتہ ہم ان نام نہاد دانشوروں اور میڈیا گروپوں سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ دوسروں کی اہانت اور خاص طور پر کروڑوں بلکہ اربوں انسانوں کے محبوب پیشواؤں کی توہین کو انہوں نے ''حقوق'' کی فہرست میں کب سے شمار کر لیا ہے کہ وہ اقوام متحدہ سے اسے ایک باقاعدہ حق کا درجہ دلوانے کے لیے مہم چلا رہے ہیں؟

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ مئی ۲۰۰۹ء)

ہندو مذہب حقیقت کے آئینے میں

جامعہ اسلامیہ ٹرسٹ کامونکی کے مہتمم مولانا عبد الرؤف فاروقی اور ان کے رفقاء ہدیہ تبریک و تشکر کے مستحق ہیں کہ دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کے تعاون سے "مطالعہ مذاہب" کے پروگرام کو تسلسل کے ساتھ آگے بڑھا رہے ہیں اور اس طرح ایک اہم ترین دینی ضرورت کسی حد تک پوری ہو رہی ہے۔ یہودیت اور عیسائیت کے بعد یہ تیسرا سیمینار ہے جو "ہندو مذہب" کے حوالے سے ہو رہا ہے اور اس کی آخری نشست میں مجھے اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی ہے۔

ہندو مذہب نہ صرف یہ کہ ہمارا قریب ترین پڑوسی مذہب ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہمارے مختلف النوع تعلقات کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ اسلام کی تاریخ پرانی ہے۔ ہندوستان کی طرف اسلامی فوجوں کے رخ کے بارے میں امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہی سوچا جانے لگا تھا۔ چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ نے "شمائل الرسولؐ" میں اس حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے کہ عدوہ بن قیس رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ شام میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ہمارے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں یہ کہا کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے شام کی طرف بھیجا تھا اور اب شام کی زمین اپنی پیداوار اور شہد ان کے سامنے ڈالنے لگی ہے، تو وہ میری جگہ شام میں کسی اور کو بھیجنا چاہتے ہیں اور مجھے ہند کی طرف بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ایک ماتحت نے کہا کہ امیر محترم! صبر کیجئے، اس لیے کہ فتنوں کا ظہور ہونے لگا ہے (یعنی آپ کہیں انکار کر کے فتنے میں نہ پڑ جائیں)۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ "جب تک عمر بن الخطابؓ زندہ ہیں کوئی فتنہ نہیں کھڑا ہو گا۔ فتنے تو ان کے بعد ہی ہوں گے۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی طرف رخ کرنے کی تیاری حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں شروع ہو گئی تھی، البتہ اس کا عملی موقع اس کے بعد آیا۔

ہندو مذہب کے پیروکاروں کے ساتھ ہماری کشمکش کی ایک طویل تاریخ ہے اور اکٹھے رہنے اور

باہمی تعلقات کی تاریخ بھی خاصی طویل ہے۔ جنوبی ایشیا میں اسلام قبول کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ان افراد اور خاندانوں کی ہے، جو پہلے ہندو مذہب کے پیرو کار تھے اور انہوں نے اسے ترک کر کے اسلام قبول کیا۔ پھر اس خطے میں اسلام اور مسلمانوں کی آمد کے بعد بہت سے معاشرتی اثرات ہیں جو ہندوؤں نے اسلام سے قبول کیے اور بہت سے معاشرتی اثرات ایسے بھی ہیں جو مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں ہندو مذہب و کلچر سے اثرات کے طور پر در آئے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بات بھی میری گفتگو کا عنوان نہیں ہے اور مجھے آپ کے سامنے جو چند گزارشات پیش کرنا ہیں وہ اس سے مختلف ہیں۔

جہاں تک ہندو مذہب کی تعلیمات کا تعلق ہے ان کی بنیاد ”وید“ کے نام سے پائی جانے والی متعدّد کتابوں پر ہے۔ وید کا لفظ علم اور دانش مندی کے لیے بولا جاتا ہے اور بہت سے ہندو دانش وروں کا کہنا ہے کہ یہ وہ الہامات اور وحی کی صورتیں ہیں جو ان کے رشیوں (پیغمبروں) کے دلوں پر القاء ہوئی تھیں اور ایسا کہنے والوں کے خیال میں یہ ”ویدیں“ آسمانی کتابیں ہیں، لیکن اس خیال کو بہت سے دوسرے ہندو علماء تسلیم نہیں کرتے۔ یہ ”ویدیں“ بہت سی ہیں، جن کے بارے میں ڈاکٹر سریندر ناتھ گپتا نے ”ہسٹری آف انڈین فلاسفی“ میں لکھا ہے کہ ”وید اپنے وسیع مفہوم کے اعتبار سے کسی خاص کتاب کا نام نہیں، بلکہ یہ نام ہے قریب دو ہزار سال کے طویل عرصے پر پھیلے ہوئے لٹریچر کا۔“

پھر وید کے بارے میں یہ روایت بھی ہندو لٹریچر میں عام ہے کہ ایک بار ساری کی ساری ویدیں گم ہو چکی ہیں، جس کے بعد صرف ایک صاحب نے اپنی یادداشت کی بنیاد پر انہیں دوبارہ مرتب کیا تھا۔ بہر حال ثقاہت و استناد کے حوالے سے ان ویدوں کی جو حیثیت بھی ہو، ہندو مذہب کے عقائد و اعمال اور احکام و قوانین کا ماخذ وہی ہیں اور ان کے حوالے سے ہندو مذہب کی جو تعلیمات نمایاں طور پر معلوم ہوتی ہیں، ان کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کر رہا ہوں:

- اگرچہ البیرونی نے اپنے دور کے حوالے سے ہندوؤں کے عقیدۂ توحید کا جس انداز میں ذکر کیا ہے وہ کم و بیش وہی ہے جو مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ چنانچہ البیرونی نے لکھا ہے کہ

  ”ہندوؤں کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا واحد ہے، غیر فانی ہے، نہ اس کا کوئی آغاز ہے نہ انجام، وہ مختار مطلق، قادر مطلق اور حکیم مطلق ہے، حی و قیوم اور احکم الحاکمین ہے، وہ رب ہے اور اپنی سلطانی میں لاثانی ہے، وہ نہ کسی کے مشابہ ہے اور نہ کوئی چیز اس کے

مشابہ ہے۔"

لیکن اس کے باوجود ہندوؤں میں بت پرستی نہ صرف یہ کہ عام ہے، بلکہ یہ عقیدہ بھی ان کے ہاں معروف ہے کہ قدیم صرف خدا کی ذات نہیں، بلکہ روح اور مادہ بھی اسی کی طرح قدیم ہیں اور اس طرح تین قدماء کو ماننے کے بعد ہندو بھی مسیحیوں کی طرح تثلیث کے علمبر دار قرار پاتے ہیں۔

- ہندوؤں میں تناسخ کا عقیدہ معروف ہے کہ ایک روح اس دنیا میں کئی قالبوں میں باری باری آتی ہے، جس کا تعلق اس کی سزا و جزا سے ہے۔ اگر ایک شخص نے اچھے اعمال کیے ہیں تو اس کی روح جسم کے مرنے کے بعد اس سے بہتر جسم اور جنم میں ظاہر ہو گی اور اگر اس نے گناہوں اور نافرمانی کی زندگی گزاری ہے تو اگلے جنم میں اسے پہلے سے بدتر جسم اور قالب دے دیا جائے گا اور یہی اس کی سابقہ بداعمالیوں کی سزا ہو گی۔
- اوتار کا عقیدہ بھی ہندو مذہب کا حصہ ہے کہ خدا کسی انسانی شکل میں کبھی کبھی ظاہر ہوتا ہے اور اس عقیدہ کے مطابق خدا کئی اوتاروں کی شکل میں دنیا میں جلوہ گر ہو چکا ہے۔
- گائے کی عقیدت اور پرستش ہندو مذہب میں موجود ہے اور اسے تقدس کا یہ درجہ حاصل ہے کہ کسی مسلمان کو اس کے مذہب سے منحرف کر کے ہندو مذہب میں شامل کیا جائے تو اسے شدھی یعنی پاک کرنے کے لیے گائے کے جسم سے نکلنے والی پانچ غلاظتوں ناک کی میل، کان کی میل، آنکھ کی میل، پیشاب اور گوبر کا مجموعہ "پنچ گئو" کے نام سے تبرک کے طور پر کھلایا جاتا ہے۔
- ہندو سوسائٹی کی بنیاد ذات پات کی تفریق پر ہے اور ویدوں کی تعلیمات کے مطابق یہ تفریق خود خدا نے کی ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ

۱. سب سے اونچی ذات برہمن کی ہے، جس کا کام لوگوں کی مذہبی رہنمائی کرنا ہے۔ انہیں مذہبی طور پر یہ معاشرتی تحفظ حاصل ہے کہ کسی جرم میں انہیں جسمانی سزا نہیں دی جا سکتی، ان پر کوئی ٹیکس لاگو نہیں ہوتا اور ان کی خدمت و احترام باقی تمام طبقات کے لیے لازمی ہے۔

۲. دوسرے نمبر پر کھتری ہیں، جن کا کام لوگوں کی حفاظت کرنا اور حکومت کرنا ہے۔

۳. تیسرے درجہ پر ویش ہیں، جن کی ذمہ داری میں تجارت، کھیتی باڑی اور مویشی پالنا ہے۔ اور

۴. چوتھا اور آخری درجہ شودر کا ہے، جو ان تینوں طبقوں کے خدمت گزار کے طور پر پیدا کیا گیا ہے۔

- ہندو معاشرہ میں وید کی تعلیم اور مذہبی رسومات کی قیادت صرف برہمن ذات تک محدود ہے، کسی دوسری ذات کا شخص اس کی جرأت نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ کسی شودر نے اگر وید کو ہاتھ لگا دیا ہے تو اس کا ہاتھ کاٹ دینے کے احکام بھی موجود ہیں۔
- عورت کے بارے میں ہندو تعلیمات میں بتایا گیا ہے کہ اس کے وجود کا مقصد صرف بچے پیدا کرنا، ان کی پرورش کرنا اور امور خانہ داری انجام دینا ہے۔ وہ باپ کی وراثت کی حقدار نہیں ہے، شوہر کی وراثت اگر اسے مل جائے تو اسے فروخت کرنے کی مجاز نہیں ہے۔
- عورت اگر بیوہ ہو جائے تو اس کے لیے عزت کا راستہ یہی ہے کہ وہ خاوند کی لاش کے ساتھ اسی کی چتا کی آگ میں جل مرے۔ اسے دوسرے نکاح کا حق نہیں ہے اور بقیہ زندگی میں وہ دیگر بہت سی سہولتوں سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔
- ہندو مذہب میں "نیوگ" کا تصور بھی موجود ہے کہ اگر کسی عورت کی اپنے خاوند سے اولاد نہ ہوتی ہو تو وہ خاوند کی مرضی سے کسی اور مرد کے ساتھ جنسی تعلق استوار کر کے اولاد پیدا کر سکتی ہے اور یہی حق مرد کو بھی حاصل ہے۔

وہ چند باتیں ہیں جو ہندو مذہب کے تعارف میں خود اس مذہب کے لٹریچر میں بھی پائی جاتی ہیں اور ان میں سب سے نمایاں بت پرستی اور ذات پات کا فرق ہے، جس نے مختلف ادوار میں خود ہندو دانشوروں کو بھی سوچنے پر مجبور کیا۔ بہت سے مصلحین نے بت پرستی اور ذات پات کے فرق کے خلاف آواز بلند کی اور ہندو مذہب میں اصلاحات کی تحریک کی:

- سکھ مذہب کے بانی بابا گورونانک کی تحریک دراصل ہندو مذہب کی انہی باتوں کے خلاف بغاوت تھی اور حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ اور دیگر مسلم صوفیاء کے زیر اثر انہوں نے بت پرستی کو مسترد کرتے ہوئے توحید کے عقیدہ کی طرف واپسی کی دعوت پیش کی، لیکن مسلم صوفیاء سے متاثر ہونے کے باوجود زبردست معاشرتی دباؤ کے باعث اسلام کی طرف آنے

کی بجائے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھ دی۔

- سولہویں صدی عیسوی میں مشرقی پنجاب کے بیر بھان نے بھی توحید کے تصور کو اجاگر کرنے کی کوشش کی اور مورتیوں اور انسانوں کے سامنے سر جھکانے اور ہاتھ پھیلانے کی نفی کرتے ہوئے جو تعلیمات پیش کیں وہ اکثر و بیشتر اسلامی تعلیمات کا پر تو دکھائی دیتی ہیں۔
- اٹھارہویں صدی عیسوی میں بنگال کے راجہ موہن رائے نے صرف ایک خدا کی عبادت کا تصور پیش کیا، بیوہ عورت کے ستی ہونے یعنی اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ جل مرنے کے خلاف آواز اٹھائی اور بیوہ عورت کی دوبارہ شادی کو رواج دینے کی کوشش کی۔ معروف بنگلہ شاعر اور دانشور راندر ناتھ ٹیگور کے والد دیوندر ناتھ ٹیگور کو بھی راجہ موہن رائے کی اس تحریک کے ایک راہنما کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور یہ تحریک تاریخ میں "برہمو سماج" کے نام سے موسوم ہے۔
- انیسویں صدی میں پنڈت دیانند سرسوتی نے "آریہ سماج" کے نام سے ایک اور اصلاحی تحریک کا آغاز کیا، بت پرستی کو مسترد کرتے ہوئے ویدوں کی نئی تشریح کی اور ذات پات کے فرق کو بھی رد کر دیا، لیکن خدا کے ساتھ روح اور مادہ کے ازلی ہونے اور دیگر بہت سی روایات سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔

ہندو مذہب کو اپنی طویل تاریخ میں ایسی بہت سی اصلاحی تحریکات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان اصلاحی تحریکات نے ہر دور میں اپنا اپنا حلقہ ضرور قائم کیا ہے، لیکن ہندو مذہب کو مجموعی طور پر یہ تحریکات متاثر نہیں کر سکیں۔ البتہ مغرب کے سیکولر فلسفہ نے مسیحیت اور بدھ ازم کی طرح ہندو مت کو بھی عملی معاشرتی زندگی سے بے دخل کر کے مندر کی حدود میں محصور کر دیا ہے اور ہندو مذہب کی جن تعلیمات کا تعلق معاشرتی زندگی سے ہے، وہ رفتہ رفتہ قصہ پارینہ بنتی جا رہی ہیں۔ مغرب کے اس سیکولر فلسفہ کو جاندار مزاحمت کا سامنا صرف اسلام کی طرف سے کرنا پڑ رہا ہے اور یہ حق بھی اسی کا ہے کہ اس وقت روئے زمین پر فطری اور زندہ مذہب کا ٹائٹل صرف اسی کے پاس ہے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۶ نومبر ۲۰۰۵ء)

مسلم سکھ تعلقات کا ایک جائزہ

۱۲، ۱۳، ۱۴ فروری ۲۰۰۶ء کو جامعہ اسلامیہ کامونکی میں مطالعہ مذاہب کے سلسلے میں بدھ مت اور سکھ مذہب کے بارے میں سیمینار تھا، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ دعوۃ اکیڈمی کے تعاون سے جامعہ اسلامیہ کامونکی نے یہ روایت رکھی ہوئی ہے کہ تین چار ماہ کے وقفہ سے کسی مذہب کے حوالے سے ایک مطالعاتی اور معلوماتی سیمینار کا اہتمام ہوتا ہے۔ علماء کرام اور طلبہ اس میں شریک ہوتے ہیں، دعوۃ اکیڈمی اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے اساتذہ کے علاوہ دینی مدارس کے بعض اساتذہ بھی مختلف عنوانات پر مقالات یا بیانات کی صورت میں شرکاء کو معلومات فراہم کرتے ہیں۔ گزشتہ تعلیمی سال کے دوران یہودیت، مسیحیت اور ہندو مت کے موضوعات پر تین الگ الگ سیمینار ہوئے، جبکہ اس سال اس سلسلے کا آغاز بدھ مت اور سکھ مت کے عنوان سے ہوا ہے اور ۱۳، ۱۴، ۱۵ مئی کو منعقد ہونے والے سہ روزہ سیمینار کے لیے اسلام سے منحرف مذاہب مثلاً قادیانیت، بہائیت، ذکری، اسماعیلیت اور نیشن آف اسلام کو عنوان بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

کچھ عرصہ سے مسلمانوں اور سکھوں کے تعلقات ایک نیا رخ اختیار کر رہے ہیں، باہمی روابط اور میل جول میں اضافہ ہو رہا ہے، لاہور اور امرتسر کے درمیان بس سروس، ننکانہ صاحب کو ضلع قرار دینے اور پنجاب کے دونوں حصوں کے حکمرانوں کے باہمی خیر سگالی کے دوروں نے مسلم سکھ تعلقات کے اس نئے رخ میں رنگ بھرنا شروع کر دیا ہے۔ اس پس منظر میں یہ سیمینار خاصا اہمیت کا حامل تھا اور اس سیمینار کی آخری نشست میں لاہور کے سکھ رہنما سردار شام سنگھ نے شرکت کر کے اور کورس کے شرکاء کو سرٹیفکیٹ تقسیم کر کے ان نئے رجحانات کو آگے بڑھایا ہے۔

میرے ذمہ اس سیمینار میں گفتگو کا جو عنوان تجویز کیا گیا تھا اس کی روشنی میں مسلم سکھ تعلقات کے مرحلہ وار جائزہ کے ساتھ ساتھ سکھ دور حکومت میں مسلمانوں کی ثقافتی حالت کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کیں، جن کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

سکھ مذہب کے بانی پانچ سو سال قبل کے ایک مصلح بابا گورونانک تھے، جو ننکانہ صاحب کے قریب

تلونڈی نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ہندو تھے، مگر بچپن میں انہوں نے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ان میں مسلمان اساتذہ بھی شامل تھے۔ ہندو معاشرے میں بت پرستی، ذات پات اور ایسی دیگر باتیں ان کے مزاج کو راس نہ آئیں اور انہوں نے ان سے نجات اور معاشرہ کی اصلاح کے لیے ہندو مذہب اور معاشرت کے دائرے میں رہنا گوارا نہ کیا۔ وہ بنیادی طور پر ایک مصلح تھے، جو معاشرہ میں عقیدت و ثقافت کی باقاعدہ مذہب کی شکل اختیار کر لی۔ گورو نانک توحید کے قائل تھے، اللہ تعالیٰ کی بندگی کی دعوت دیتے تھے اور ذات پات کے فرق کی نفی کرتے تھے۔ وہ مسلم صوفیاء کرام بالخصوص حضرت بابا فرید گنج شکر رحمہ اللہ سے متاثر تھے، صوفیاء کرام کی خدمت میں حاضری دیتے تھے۔ انہوں نے مکہ مکرمہ کا سفر بھی کیا اور مبینہ طور پر حج کے اعمال میں شریک ہوئے، لیکن مسلمان نہیں ہوئے، بلکہ مسلم صوفیاء کی طرز پر ایک جداگانہ روحانی سلسلہ کا آغاز کر کے لوگوں سے بیعت لینا شروع کی اور خانقاہی طرز پر اپنے نئے حلقے کی بنیاد رکھی۔

سکھوں کی عبادت گاہ اور مذہبی مرکز کو گوردوارہ کہا جاتا ہے اور اس کی شب و روز کی سرگرمیاں مسلم صوفیاء کے پرانے خانقاہی نظام سے ملتی جلتی ہیں۔ میں نے کچھ عرصہ قبل برطانیہ کے شہر برمنگھم میں مولانا محمد عیسیٰ منصوری اور مولانا سید سلمان الحسنی ندوی لکھنؤ کے ہمراہ ایک بڑے گوردوارے کا دورہ کیا تھا اور اس کے اندرونی نظام اور معمولات کا جائزہ لیا تھا۔ گوردوارے کو "پانچ پیاروں" کی ایک کمیٹی چلاتی ہے اور اس کے روز مرہ اعمال میں دو باتیں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ گوردوارے کے مین ہال میں ان کی مذہبی کتاب گورو گرنتھ مسلسل پڑھی جاتی ہے اور گورو صاحبان باری باری اسے بلند آواز سے پڑھتے رہتے ہیں، یہ سلسلہ کسی وقفہ کے بغیر چوبیس گھنٹے چلتا ہے۔ اس ہال میں اسی طرح کا ماحول بنایا گیا ہے جیسے ہمارے ہاں مساجد میں ہوتا ہے۔ جوتے اتار کر اندر جاتے ہیں، پہلے گرو گرنتھ صاحب کو جو ہال کے وسط میں ہوتا ہے ماتھا ٹیکتے ہیں یعنی سجدہ کرتے ہیں، پھر بڑے ادب سے بیٹھ کر گرو گرنتھ کی قراءت سنتے ہیں اور جب جانا چاہیں اسی ترتیب کے ساتھ ماتھا ٹیکتے ہوئے الٹے پاؤں ہال سے باہر نکل جاتے ہیں۔ ماتھا ٹیکنا ہال میں داخل ہونے کے لیے شرط کا درجہ رکھتا ہے، ہم سے بھی اس کا تقاضا کیا گیا مگر ہم نے انکار کر دیا، جس پر گوردوارے کے پانچ بڑوں کی بیٹھک ہوئی اور

انہوں نے مہمان داری کی خاطر خصوصی رعایت دیتے ہوئے ہمیں ماتھا ٹیکے بغیر ہال کے اندر جانے کی اجازت دے دی۔

۲. گوردوارے کا دوسرا بڑا عمل جو ہم نے دیکھا لنگر خانہ ہے، جہاں ہر وقت کھانا پکتا رہتا ہے اور لوگ آکر وہاں مسلسل کھانا کھاتے رہتے ہیں۔ یہ عمل بھی چوبیس گھنٹے کسی وقفے کے بغیر جاری رہتا ہے۔ کھانا کھانے کے لیے مذہب کی کوئی قید نہیں اور کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والا شخص کسی وقت بھی وہاں آکر کھانا کھا سکتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ ریکارڈ کے مطابق روزانہ تقریبًا چھ ہزار افراد وہاں آکر کھانا کھاتے ہیں۔

ہر وقت ذکر و اذکار اور لنگر کا یہ عمل مسلم صوفیاء کرام کی خانقاہوں کا امتیاز ہوتا تھا اور اسے ہی تھوڑے بہت رد و بدل کے ساتھ سکھ مذہب میں اختیار کیا گیا ہے۔ سکھ مذہب کا آغاز خانقاہی طرز کے اس نظام سے ہوا تھا اور ابتدا میں جہانگیر کے دور تک سکھوں کے سیاست کے ساتھ کسی تعلق کا اظہار نہیں ہوتا، البتہ شاہجہان کے دور میں جب داراشکوہ اور اورنگزیب عالمگیر کے درمیان کشمکش عروج پر پہنچی ہے تو اس وقت کی سکھ مذہبی قیادت کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اس نے داراشکوہ کو سپورٹ کیا اور اورنگزیب عالمگیر کے دور میں سکھوں نے عسکری جتھہ بندی کے ساتھ ساتھ سیاسی طور پر بھی پرزے نکالنے شروع کر دیے، جس کے نتیجے میں ان کے اس وقت کے گرو تیغ بہادر گرفتار ہوئے اور قتل کر دیے گئے، جس سے مسلم سکھ کشمکش کا مستقل طور پر آغاز ہوا اور یہ کشمکش قیام پاکستان تک مسلسل جاری رہی۔

اورنگزیب عالمگیر کے بعد مغل حکومت باہمی خانہ جنگی اور شہزادوں کی آپس کی اقتدار کی جنگ کے باعث کمزور ہوتی چلی گئی، جبکہ پنجاب کے مختلف علاقوں میں سکھوں کے گروپ منظم ہوتے گئے اور علاقائی طور پر ان کا اقتدار قائم ہوتا گیا، حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جس طرح جنوبی ہند میں ہندو مرہٹے ایک اہم فوجی اور سیاسی قوت کی حیثیت اختیار کر گئے تھے، اسی طرح پنجاب میں سکھ ایک مضبوط قوت بن گئے اور انہوں نے علاقائی طور پر بہت سی تقریبًا خود مختار ریاستیں قائم کر لیں، جن کے سامنے مغل اقتدار بتدریج بے بس ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی تیسری لڑائی میں مرہٹوں کو شکست فاش دی تو اس کے بعد وہ پنجاب کے سکھوں کی طرف بھی متوجہ ہوا اور بعض

جنگوں میں ان کو شکست دی، مگر افغانستان کے داخلی حالات اور خلفشار کے باعث وہ ان سے پانی پت کی طرز کی کوئی فیصلہ کن جنگ نہ لڑ سکا اور پنجاب میں سکھوں کی قوت اور اقتدار میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا۔

پنجاب میں ایک دور میں سکھوں کی بارہ مثلیں (اندرونی خود مختار ریاستیں) قائم ہوئیں جو بعد میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں ایک بڑی سکھ حکومت کا حصہ بن گئیں اور جب ایک نامور سکھ سردار مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پنجاب پر قبضہ کیا تو اس کی سلطنت میں پشاور سے لے کر ملتان تک علاقہ شامل تھا، کشمیر بھی اس کا ایک حصہ تھا۔ اس دور کے بارے میں مؤرخین لکھتے ہیں کہ پنجاب کے ایک بڑے علاقے میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل نہیں تھی، ان کی مساجد پر قبضہ کر لیا جاتا تھا، سکھ اکثریت کے گاؤں میں مسلمانوں کو مسجد میں اذان دینے اور باجماعت نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی، حتیٰ کہ ایک دور میں لاہور کی تاریخی بادشاہی مسجد سکھ فوج کی چھاؤنی اور گھوڑوں کے اصطبل کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

شہدائے بالاکوٹ نے جب ۱۸۳۰ء میں پشاور پر قبضہ کیا تو اس وقت پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت تھی اور بالاکوٹ میں جب سید احمد شہید رحمہ اللہ نے جام شہادت نوش کیا تو ان کا سامنا رنجیت سنگھ کے بیٹے شیر سنگھ کی زیر کمان سکھ فوج سے تھا۔ امیر المؤمنین سید احمد شہید رحمہ اللہ کی زیر قیادت لڑی جانے والی اس جنگ کے مقاصد میں برطانوی استعمار سے گلوخلاصی اور پورے ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ پنجاب کے مسلمانوں کو مذکورہ بالا مظالم سے نجات دلانا بھی شامل تھا۔

مسلم سکھ کشمکش کا ایک تاریخی پہلو یہ بھی ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جب مجاہدین نے جنرل بخت خان کی قیادت میں دہلی پر قبضہ کر کے انگریزوں کو وہاں سے باہر نکال دیا تھا تو انگریزوں کی حمایت میں پنجاب سے تازہ دم سکھ فوج گئی تھی، جس نے دہلی پر انگریزی اقتدار کی دوبارہ بحالی کے لیے اہم کردار ادا کیا اور اسی مسلم سکھ کشمکش کے خوفناک نتائج دنیا نے قیامِ پاکستان کے وقت تقسیم پنجاب کے بعد مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے وحشیانہ قتلِ عام کی صورت میں دیکھے، جن کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اس پس منظر میں مسلم سکھ تعلقات کے اس نئے دور کا جائزہ لینا چاہیے جب مشرقی پنجاب میں

سکھ اکثریت نے اپنے سیاسی و مذہبی حقوق کی مسلسل پامالی دیکھ کر "آزاد خالصتان" کی تحریک کا آغاز کیا اور پاکستان کے بہت سے حلقوں نے اسے سپورٹ کیا۔ ایک دور میں سکھوں اور قادیانیوں نے مشترکہ طور پر اس بات کی تحریک چلائی تھی کہ پاکستان میں ننکانہ صاحب اور بھارت میں قادیان کو مقدس شہر کا درجہ دے کر کھلا شہر قرار دیا جائے، لیکن بات آگے نہ بڑھ سکی۔ مگر اب سکھوں کی سیاسی محرومیاں اور پاکستان کی علاقائی سیاسی ضرورتیں ایک نئے رومان کا باعث بن رہی ہیں، جن کی طرف ہم مسلسل پیش رفت ہوتی دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں اس سے کوئی انکار نہیں اور اگر مسلمان اور سکھ مشترکہ مفادات اور ضروریات میں ایک دوسرے کے کام آنا چاہیں تو ہماری یہ گزارش ضرور ذہن میں رکھیں کہ مستقبل کے رومانس کی طرف بڑھتے ہوئے ماضی کے حقائق اور یادوں کو بھلا نہ دیا جائے، کیونکہ ماضی کو بھول جانے والی قومیں مستقبل کی طرف بہتر پیش رفت نہیں کر سکتیں۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۹ فروری ۲۰۰۶ء)